

مت زحانی آئی اے رحمن سے ایک انٹرویو

کراچی سے چیف ریلوے تک ہمید ریاض کا سفرنامہ

صفدر ہاشمی جسے بنیاد پرستوں نے شہید کیا

سیاسی، ادبی اور علمی تحریروں کا مجموعہ

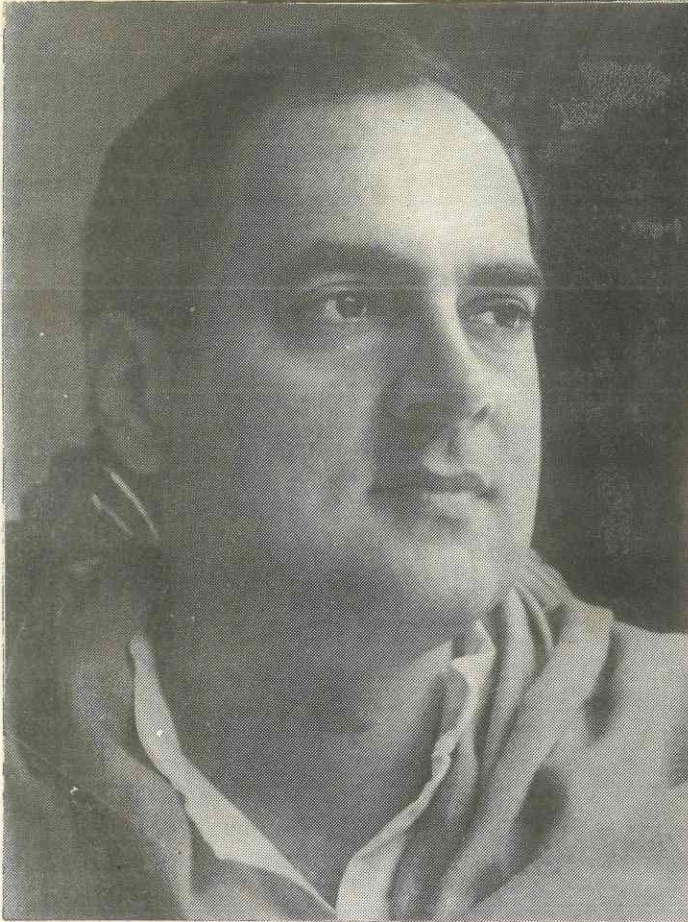
روشن خیال

کتاب سلا

3



آزاد فلسطین
ایک عظیم کامیابی



چوتھی سارک کانفرنس
ایک تجزیہ



روشن خیال

کتابی سلسلہ

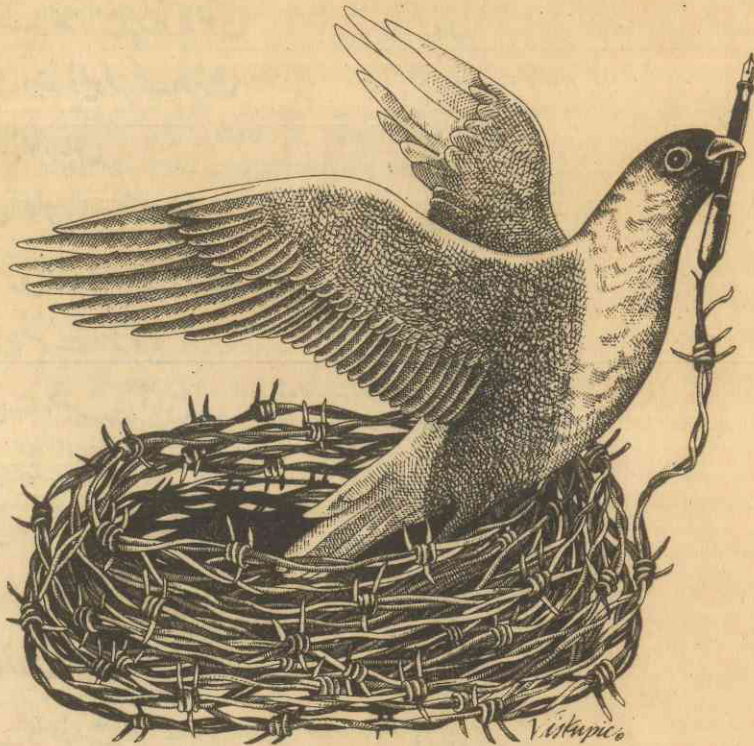
(۳)

مشاورت

زاہدہ حنا

ادارت

ندیم اختر
اظہر عباس



پوسٹ بکس: ۱۱۱۲۶ - گلشن اقبال کراچی ۷۷

طابع: شادمان پرنٹنگ پریس

قیمت: ۸ روپے

روشن خیال

۷	ادارہ	اداریہ
۹	قارئین	ہمارے نام
۱۰	ارشاد گوڑ	آزاد فلسطین
۱۱	آئی اے رحمن	چوتھی سارک کانفرنس
۱۲	اظہر عباس	صفدر ہاشمی کی شہادت
۱۴	نمائندہ روشن خیال	آئی اے رحمن سے انٹرویو
۱۸	ادارہ	بنیاد پرستی کا مایہ ناز جوہر
۱۹	ادارہ	سر سید احمد خان پر کفر کا فتویٰ
۲۰	ندیم احمد	لیفٹ اینڈ ڈیموکریٹک فرنٹ
۲۱	ک۔ و	قومی ناہمواریاں
۲۳	نمائندہ روشن خیال	اقبال اعوان سے انٹرویو
۲۵	مشعل	حقیقی ترقی اور سامراجی اثر و نفوذ
۲۶	نمائندہ روشن خیال	عابد حسن منٹو سے انٹرویو
۲۸	ہمنیدہ ریاض	کراچی سے حیدر آباد تک
۳۱	ابن لطیف	جوہری جنگ
۳۲	زاہدہ حس	آخری بوند کی خوشیو
۴۲	ادارہ	شہید وطن اشفاق اللہ خاں
۴۳	شاہد لطیف	امریکی ذرائع ابلاغ
۴۵	فیضانہ فرنام	بھوک کا عفریت
۴۶	ناظر محمود	سوویت مسلمان
۴۸	محمد نفیس	المیہ شکاگو کا پس منظر

گذشتہ تیس دنوں میں قومی اور بین الاقوامی منظر نامے پر بہت سے خوشگوار اور ناخوشگوار واقعات کے اخراجات مرتب ہوئے ہیں۔ کوشش کریں گے کہ تیس دنوں میں ہر نیا لے پیشہ اہم معاملات کا اختصار سے ہی سہی ایک موضوعی جائزہ لے سکیں۔ سب سے پہلے ہماری نظر پاکستان کی طرف اٹھتی ہے جہاں پچھلے دنوں جو کتنی سارے کانفرنس، نشستات خوشگوار اور ناخوشگوار منعقد ہوئی اور بہت مثبت اور امید افزا انداز میں اختتام کو پہنچی۔ کانفرنس میں شریک تمام ممالک نے باہمی دلچسپی کے دو طرفہ معاملات پر گفت و شنید کی۔ اور علاقے میں امن قائم رکھنے اور اپنے اپنے ملکوں سے بھوک، طاعون، جہل اور بیماریوں کے خاتمے کا معاہدہ کیا۔ ملک کی یہ چوتھی کانفرنس چونکہ پاکستان کی نئی اور منتخب جمہوری حکومت کے زیر انتظام منعقد ہوئی تھی اس لیے سب سے ملک ہندوستان کا دو طرفہ قطعاً مختلف تھا۔ اس سے پہلے ہندوستان کے جمہوری حکمران پاکستان کی طرف سے وزیر اعظم نے پاکستان کی سر زمین دلی دعوؤں کو مسترد کرتے رہے تھے لیکن اس بار ایک بہت طویل مرحلے کے بعد ہندوستان کے وزیر اعظم نے پاکستان کی سر زمین پر قدم رکھا اور دو طرفہ تعلقات کو بہتر بنانے کے معاملے میں گہری دلچسپی لی۔ تین معاہدوں پر دستخط ہوئے اور دو نئی اور غیر ملکی کی گفتگو کو تقویت پہنچانے کے لیے آمیزہ بھی سربراہ مذاکرات کے انعقاد اور ثقافتی تبادلوں کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

چوتھی سارے کانفرنس کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ برسوں سے پاکستان کو مغربی ایشیا کا صحرانے کی جو غیر فطری کوششیں ہو رہی ہیں ان کی بجائے جو اصل فطرتی ہوئی اور مغربی تہذیب کے سبب ہمارے ملک میں جو ثقافتی بگاڑ ہو چکا ہے اسے ختم کرنے، برصغیر کے حلقے سے اپنی شناخت کو ابھارنے کا اور اپنی ثقافت کو اپنی دھرتی سے جوڑنے کا عمل شروع ہوا ہے۔ برصغیر کے استحکام کو سامراج نے اپنے عزائم کی خاطر پارہ پارہ کیا۔ جس کے سبب اس علاقے میں شدید کشیدگی اور ایک دوسرے پر بے اعتمادی پیدا ہوئی۔ سارے کانفرنس کا جوہر درحقیقت یہی ہے کہ برصغیر اور جنوبی ایشیا میں ثقافتی، تہذیبی، تمدنی، علمی اور ادبی رابطوں کو بحال کیا جائے، انہیں فروغ دیا جائے اور ایک دوسرے کے قریب آنے کا وہ عمل شروع ہو جو تمام دریا سواؤں میں وحدت، فکر اور وحدت علی پیدا کرے۔ اس پورے خطے میں امن کو بڑھا دینے کے لیے یہ ایک راست اور خوش آئند قدم ہے۔ اس وقت ملک میں آٹھویں ترمیم کے بارے میں نہایت تنجید اور اہم بحث چل رہی ہے۔ آٹھویں ترمیم کے خاتمے کے سلسلے میں مختلف نقطہ نظر سامنے آئے ہیں۔ ایک نقطہ نظر حکومت کا ہے جو اس ترمیم کو ختم کر کے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے پہلے کی آئینی پوزیشن بحال کرنے کی خواہشمند ہے۔ دوسری طرف اسلامی جمہوری اتحاد ہے جس کا کہنا ہے کہ وہ ہر قیمت پر اس ترمیم کے خاتمے کی مخالفت کرے گا اور تیسری طرف ایم آر ڈی کی چند جماعتیں ہیں جو اتحادیات سے قبل آٹھویں ترمیم کی تصحیح پر اصرار کرتی تھیں لیکن اب وہ اس بارے میں دو دلی کا شکار ہیں۔ یہاں پر یہ بات یاد دلانی بھی ضروری ہے کہ انتخابات سے پہلے اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل بعض جماعتیں بھی اس کی مخالفت کرتی رہی ہیں۔

آٹھویں ترمیم کے بارے میں مختصر ترین طور پر یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ ایک ستر کا عوام دشمن اور جہوریت کش اقدام تھا جسے اس نے آئینی لبادہ پہنانے کی کوشش کی تاکہ اپنے اقتدار کو زیادہ سے زیادہ طویل دے سکے اور اپنے خیر و اختیار کو ملک کے بدن میں زیادہ گہرائی تک اتار سکے۔ اس ترمیم نے ۱۹۷۴ء کے آئین کو مسخ کر دیا جس کے سبب آئین پارلیمانی کی بجائے صدارتی آئین میں تبدیل ہو گیا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آٹھویں ترمیم کا مکمل خاتمہ ہی پاکستانی عوام کے جمہوری حقوق کے تحفظ اور ملک میں جمہوری نظام کے فروغ کی اولین شرط ہے۔ وہ افراد یا وہ جماعتیں جو اس ترمیم کی منسوخی کا حلف کر رہی ہیں وہ دراصل عوام دشمن، آمریت فائز و جہت پرست قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ہم یہ طور خاص ترقی پسند و سب وطن عوام دوست جماعتوں کے رہنماؤں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اس بارے میں ایک واضح اور حتمی رویہ اختیار کریں گے۔ اور موجودہ حکومت کے ساتھ آٹھویں ترمیم کے خاتمے کے بارے میں مکمل اتفاق کریں گے۔ ہمارے خیال میں اس ترمیم کی منسوخی اور ۱۹۷۳ء کے آئین کی بحالی پاکستان میں جمہوریت کے احیاء اور فروغ کیلئے لازم شرط ہے۔ اس بات کو یہ عوام دوست اور جمہوریت پسند قوتوں کا اپنے فرائض سے پہلو دینا کہ تاکہ بغیر حق قتل بھی جائے۔ عوام دوست اور ترقی پسند جماعتوں کا ذکر نہ کرنا تو ایسی ڈی الیف کے لاکھ بکھڑاؤں کا ذکر بھی بہت ضروری ہے۔ ایسا طائفہ نے ترقی پسند قوتوں کی نیکیاں کے لیے ایک غلطی قدم اٹھایا ہے جس سے عوام کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بائیں بازو کے تمام محنت کش نوابین اور طلبہ تنظیمیں باہمی اشتراک کی راہیں تلاش کریں تاکہ وہ جمہوری سر زمین اور ایک منصفانہ سماج کے قیام کی جدوجہد کو تیز کر سکیں۔

ہم اس کی توقع رکھتے ہیں کہ رائل ڈی الیف میں ان تنظیموں کو بھی شامل کیا جائے گا جو ابھی تک اس عمارت سے باہر ہیں اور جن کی شمولیت سے ترقی پسند قوتوں کو مزید استحکام ملے گا۔

منفی انتخابات کا ان دنوں سارے ملک میں چہ چاہے لیکن صوبے سے زیادہ اہمیت کوٹ اٹھ کر نشست کو دی جا رہی ہے۔ جہاں سے کسی سے کسی کے ایک رہنما غلام مصطفیٰ جتوئی انتخاب لڑ رہے ہیں۔ جتوئی ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں اپنی آبائی نشست پر بری طرح شکست کھا چکے ہیں اور اب ان کے پرانے رفیق مصطفیٰ اکھر نے انہیں ایک بار پھر اس بات کا موقع دیا ہے کہ وہ ان کی چھوڑی ہوئی اس نشست پر انتخاب لڑ کر جیتے ہوئے ہونے کا اعزاز حاصل کریں۔ اس نشست پر ہونے والے انتخاب کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔ ہم تو صرف اتنی ہی بات جانتے ہیں کہ غلام مصطفیٰ جتوئی ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے ایک طویل عرصے تک جنرل ضیا کی آمرانہ حکومت سے درپردہ ساز باز جاری رکھی اور جنرل ضیا کے بعد اس آمرانہ حکومت کے باقیات و معاملات کے ساتھ کھلم کھلا گٹھ جوڑ کر اپنی اور اب وہ جنرل ضیا کے وارثوں یعنی اسلامی جمہوری اتحاد کے نہ صرف اہم رہنما ہیں بلکہ اس کی جانب سے انہوں نے گزشتہ انتخاب لڑا اور اب ایک بار پھر اس کے نمائندے کے طور پر ضمنی انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔

غلام مصطفیٰ جتوئی کی یہ سیاسی حکمت عملی ان کے حقیقی کردار کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور وہ انہوں نے گٹھ منٹ کی بجائے اقتدار سے گٹھ منٹ کا عہد نہایتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس بنیاد پر ہم سمجھتے ہیں کہ بائیں بازو کی جماعتوں اور ملک کی تمام جمہوری قوتوں کو غلام مصطفیٰ جتوئی اور ایسے ہی دوسرے تمام لوگوں کی مخالفت کرنی چاہیے۔

یہ مخالفت اس روشنی میں اور زیادہ ضروری ہے کہ اکتانک دیو لوہے کے مطابق وہ فوج اور قدامت پسندوں دونوں کے پیرویدہ امیدوار ہیں۔ ہمارے ملک کا ایک نہایت سنگین مشکلی سے برصغیر ہوئی ہے روز گاری ہے۔ بیروزگاری کی وبا جس تیزی سے شہروں میں پھیل رہی ہے۔ دیہاتوں میں بھی بیروزگاروں کا تناسب اسی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ تازہ ترین

اعداد و شمار کے مطابق صرف سندھ کے شہروں میں اس وقت بائیں ہزار ڈاکو بے روزگار ہیں۔ جبکہ ملک کی اور صوبے کی طبی صورتحال یہ ہے کہ ریلوے کی ایک بڑی تعداد ڈاکوؤں کے نہ ہونے کے سبب بلاک ہو جاتی ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ وقت علاج نہیں ہوا یا۔ بے روزگاری کی یہ بدترین صورتحال گزشتہ امریت کا درجہ ہے جو منتخب حکومت کے حصے میں آیا ہے۔ نئی منتخب حکومت کو ہنگامی بنیادوں پر بیروزگاری سے نمٹنے کے لیے اقدامات کرنے چاہیں تاکہ اس سلسلے میں عوامی سطح پر جو شدید بے چینی پائی جاتی ہے اس میں کمی ہو سکے۔

روشن خیال

اب ہم ملک سے باہر کے معاملات پر نظر کرتے ہیں تو سب سے پہلے جو مبینہ واقعہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ وہ بے سال کا آغاز ہونے ہی امریکہ کی طرف سے ایک بار پھیلپس کے خلاف ملکی جارحیت کا مظاہرہ۔ آزاد ذرائع سے ملنے والی مصدقہ اطلاعات کے مطابق امریکی قیادوں نے بلا جواز اور کسی اشتغال کے بغیر پھیلپس کے دوائے کی یادوں کو میزائل مار کر تباہ کر دیا جو نہ انہیں لگا رہے تھے، نہ ان کا تعلق کر رہے تھے اور نہ ان کے لیے کسی بھی خطرے کا سبب تھے۔

پہلا ہی طیارے معمول کی پرواز پر تھے کہ اچانک کسی وارننگ کے بغیر وہ امریکی دہشت گردی کی بھیڈنٹ چٹھر گئے۔ یہ کوئی پہلا یا تیسرا واقعہ نہیں۔ اس سے پہلے بھی امریکہ بار بار اس نوعیت کی بین الاقوامی دہشت گردی میں ملوث رہا ہے اور پڑا من ملکوں کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرتا رہا ہے۔

امریکہ کا مسئلہ پھیلپس کے ایک ایسے کارخانے کو تباہ کرنا ہے جو دو ایٹمی تیار کرتا ہے لیکن جس کے بارے میں امریکہ کا اصرار ہے کہ وہ کیمیائی ہتھیار بنانے کا کارخانہ ہے۔ یہ بیان اس الزام کی بہ اواز تزدید کی ہے تاہم امریکہ نہ صرف یہ کہ اس تردید کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں بلکہ اس نے پھیلپس کے ان دو طیاروں کو تباہ کر کے اسے ایک ناکرہ غناہ کی سزا دی۔ امریکہ کا یہ اقدام نہ صرف یہ کہ ایک آزاد اور خوشحالیار ریاست کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہے بلکہ اس سے ان دعوؤں کی بھی نفی ہوتی ہے جو امریکہ وقتاً فوقتاً عالمی امن اور عالمی یکجہی میں خلل کے لیے جاری کرتا رہتا ہے۔ ہم امریکہ کے اس وحشیانہ اقدام کی پُر زور مذمت کرتے ہیں اور دنیا کی تمام جمہوری قوتوں سے امید کرتے ہیں کہ وہ اس مذمت میں بلابرکے شریک ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہم امریکی عوام سے بھی اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے حکمرانوں پر دباؤ بنائیں گے کہ وہ سلامتی اور پرامن بقائے باقی کا راستہ اختیار کریں تاکہ دنیا انسان کے لیے گوشہ عافیت بن سکے۔

جہاں تک افغانستان کی تازہ صورتحال کا تعلق ہے تو یہ بات واضح ہے کہ سوویت یونین ۱۵ فورے سے پہلے ہی اپنی فوجوں کی واپسی کا تہیہ کر چکا ہے۔ گوشہ دوزں سوویت یونین کے نائب وزیر خارجہ مسٹر شوق نے پاکستان کو دہرایا اور افغان چھاپہ ماروں کے نمائندوں سے گفت و شنید کے دوران کا بل میں ایک وسیع البیاد قومی حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی جسے افغان چھاپہ ماروں کے نمائندوں نے رد کر دیا۔

افغانستان میں پائیدار امن کے لیے ایک وسیع البیاد حکومت کا قیام ضروری ہے جس میں افغانستان کی موجودہ حکومت اور اس کی حلیف یا بی جا محنتوں کی بھی باضمی اور بھرپور شرکت ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کابل کی موجودہ حکومت جو تمام ریاستی اداروں مثلاً انتظامیہ، فوج، پولیس اور عدلیہ پر مکمل کنٹرول رکھتی ہے اور جسے عوام کی بھاری اکثریت کی حمایت حاصل ہے، اسے بیکر نظر انداز کر کے محض سات چھاپہ مار تنظیموں کے نمائندوں پر مکمل حکومت قائم کی جائے اور پھر توقع یہ رکھی جائے کہ افغانستان میں پائیدار امن کا قیام ممکن ہو سکے گا۔

افغانستان کی جنگ نے پاکستان پر بہت زیادہ اور دور رس اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہم افغانستان میں ایک پائیدار امن کے خواہاں ہیں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمام نہاد مجاہدین اپنے موقف میں یکجہ ہو سکیں۔ اب یہ ذمہ داری امریکہ اور اس کے حلیف ملکوں کی بنتی ہے جو اس طویل جنگ میں افغان چھاپہ ماروں کے زیر دست حمایتی رہے ہیں اور جن کی وجہ سے افغانستان کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہوا۔ کہ وہ افغان چھاپہ ماروں پر مل کر وہ قیام و باق و اہلین تاکہ یہ نام نہاد مجاہدین، معاملہ فہمی سے کام لیں۔ مشیت رویہ اپنائیں اور سوویت یونین کی سطح پسندانہ پالیسی کو اس کی کمزوری تصور نہ کریں۔ اور صراحتاً یہ جہاں کی بنیاد پرست اور عوام دشمن حکومت مسلسل اپنے سیاسی مخالفین کو پھینچنے پر کمر بستہ ہے۔ روشن خیالی کی گزشتہ اشاعت میں ہم نے ایران میں شہید ہونے والے ساتھیوں کے ناموں کی ایک مکمل فہرست بھی دی تھی۔ یہ بات ہم سب کے لیے نہایت غم و اندوہ کی ہے کہ اس فہرست میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور ہر روز ایران سے ہلاک شدگان کی ایک نئی فہرست آجاتی ہے۔

عراق سے جنگ بندی کے بعد ایران کی بنیاد پرست حکومت کو اس بات کا شدت سے احساس ہو گیا ہے کہ وہ 'جنگ' کا ہتھوڑا کھڑکھڑا کر لوگوں کو مزید بے وقوف نہیں بنا سکتی چنانچہ اس نے ان لوگوں کو جن پر حق ختم کرنے کا تہیہ کر لیا ہے جو عوامی مزاحمت کے دوران انقلاب کا ہراول دستہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ گزشتہ چند ہفتوں میں کئی سو لوگوں کو گولیوں کی بارش سے ہلاک کیا گیا اور کئی سواڑا پھانسی چڑھا دیے گئے۔

اطلاعات کے مطابق ایرانی حکومت زیر محنت قوانین سیاسی کارکنوں پر سرسری سماعت کی نام نہاد مذہبی حلقوں میں مقدمہ چلانے والی ہے جہاں ان قوانین کو پیشگی کی جائے گی کہ اگر وہ زندہ رہنا چاہتی ہیں تو عوام سے بھاری کس اور اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوئیں تو انہیں فوری طور پر گولی مار دی جائے گی۔ جن مقدمہ ایذا ناک قوانین سیاسی رہنماؤں کی جان کو ایرانی حکام کی جانب سے فوری خطرہ ہے ان میں ۷ سالہ مریم فروز بھی شامل ہیں جو انجمن جمہوریت پسند خواتین ایران کی سابق صدر اور یونیورسٹی کی پروفیسر اور محقق ہیں۔

اس بھیانک استبداد کے خلاف ملک کی مختلف ترقی پسند اور عوام دوست جماعتیں ایران کی خواتین سیاسی قیدیوں، ایران میں انسانی حقوق اور شہری آزادی کی پامنائی کے خلاف مظاہرے کر رہی ہیں اور احتجاجی مراسلے ایرانی مقامی حکام کے حوالے کیے جا رہے ہیں۔ ایران کے مظلوم عوام سے یکجہتی کے اظہار کے طور پر دوستوں کو چاہیے کہ وہ اس قسم کے مظاہروں کا ہر شہر اور قصبہ میں انتظام کریں اور ایسے اجتماعات میں بھاری تعداد میں شریک ہو کر اس ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔

اور آخر میں ایک ایسے نوجوان کو آخری سلام جو ہندوستان میں عوامی تھیٹر کا ایک ٹرا اور اہم نام اور ترقی پسند ثقافتی محاذ کا ایک سرگرم رہنما تھا ہماری مراد مسٹر باغشی ہے جو بی آئی ایم سے تعلق رکھتے تھے اور جن کی ساری جدوجہد ہندوستان کے پسماندہ طبقے کی سرپرستی اور اس کو بڑھاد دینے کے لیے تھی۔

مسٹر باغشی نے 'جن نابیناؤں' کے کنوینر ہونے کی حیثیت سے جولا تعداد عوامی ناٹک اسٹیج کیے اور اس کے پسماندہ طبقے پر جو اثرات مرتب ہو رہے تھے اس کے سبب سرمایہ دار طبقہ اور کالادھن بنانے والے ان سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ آخر کار انہیں ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور چند کڑے کے خنڈیوں کے ہاتھوں انہیں شہید کر دیا گیا۔

مسٹر باغشی ہندوستان کے پسماندہ اور تالار عوام کی ترقی اور بہتری کے لیے دن رات کوشاں تھے۔ انہوں نے اپنی جوانی اس عظیم مقصد کی نذر کی۔ اور آخر کار جان سے گزر گئے۔ ان کی شہادت ہندوستان کے تمام ترقی پسند طبقوں کے لیے عمیق نقصان ہے۔ ہم مسٹر باغشی کی بیوہ ان کے اہل خانہ، دوستوں، ساتھیوں اور بہن بھائیوں کو ان کی رخصت کا پر سرہ دیتے ہیں اور اس خندہ گردی کی شدید مذمت کرتے ہیں جس کے پس پشت سرمایہ داروں کا ہاتھ ہوتا ہے اور جو چین ان لوگوں کو شکار کرتا ہے اور لافانی سماج کے لیے کسی نہ کسی محاذ پر سرگرم عمل ہیں۔



ہمارے نام



ڈیرہ اسماعیل خان سے شاہد عظمیٰ

ہم امید کرتے ہوئے تحریر کر رہے ہیں کہ آپ تمام تقاضات اور تفریاتی دوست گیری سے ہوں گے۔

ایک مملوفاقی اور ترقی پسند رسالہ روشن خیال شائع کر کے آپ فیاض کے سیاسی شعور میں جس قدر اضافہ کر رہے ہیں اس کیلئے ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی ایسی تحریریں سے ایک بہتر معاشرے کے قیام کے سلسلہ میں مدد دیں گے۔ میں نے روشن خیال کو پڑھا جو کہ ایک قابل احترام پرچام ہے اور سیاسی شعور میں اضافہ کا نام ہے۔ پاکستان میں ترقی پسندوں کا سلسلہ ایک تو بہت کم ہے دوسرے وہ عام آدمی کی پہچان سے باہر ہے کیونکہ پاکستان میں ترقی پسندوں کے ایک طرف دامن بہت زیادہ ہیں تو دوسری طرف ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں ترقی پسند سیاسی نظریاتی تحریکوں کو کشمکش کا سامنا ہے۔ پاکستان میں چند ایک سیاسی رسالے اور چند ایک اخبارات بھی جو وقت کے ساتھ ساتھ عوام کے سیاسی شعور میں اضافہ کرتے ہیں۔ پاکستان کی سابق حکومت جو کہ ایک غیر انسانی اور غیر قانونی ہے جو مجرموں پر مشتمل تھی اس نے اغالات اور رسالوں و دیگر کو اپنے اقتدار کے لیے استعمال کیا اور ملک کو روشن خیال ترقی پسند خیالات سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ ملک میں عوام کو مذہب کے نام پر دھوکا دیا اور ملک میں مذہب اور قومیت کے نام پر فسادات کو روکنے کی طرف توجہ کی کہ دولت سے غریب آدمی کے بچوں کو محروم رکھا گیا۔ تمام ایشیائی ترقی پسندوں کے سامنے میں اضافہ کر کے صفحہ بحران میں اضافہ کیا۔ انسانی مسائل کو بے رنگ و لکڑی کا شکار کیا۔ ترقی پسندوں کو استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا تو دوسری طرف ملک میں مذہبی تفریق و فسادات کی بدولت سے فوجی افسرانوں نے سیاسی تحریکات اور ترقی پسند شعور کو حاصل کرنا شروع کر دیا۔ ان مذہبی تفریق و فسادات نے ہر طاقت امریکہ کے خلاف کوئی بات نہ کی اور اس طرح سیاسی شعور کھنڈے والے سیاسی لوگوں کو اس ہوا کو اس ملک کے مذہبی تفریق و فسادات کا کسی غیر ملک کے ایجنٹ ہیں۔ لیکن اسلام کے نام پر عوامی قوت تقسیم کرنے کی کوشش کر کے غیر ملکی اگھاؤں کے مفادات کا تحفظ کیا گیا۔

شمال آباد سے

افتخار انجم

چند ایک ضروری امور کی انجام دہی کے لیے کوئی جگہ تھکام سے فراغت کے بعد سوچا کہ کچھ لکچر خرید لوں۔ اسی پہلے وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔

لکچر خریدتے ہوئے اچانک روشن خیال پر نظر پڑی اور چونکہ اس کے نام سے ظاہر ہے دیرپا ہی پایا۔ اس کے سلسلہ کے بعد محسوس ہوا کہ پاکستانی ادب اور ادبیات و تنہا کے لیے ترقی پسند ادب کا واحد ترجمان ہے۔ یہ محض سائنس آڈیو نہیں بلکہ ایک سلیس حقیقت ہے جس کا ادراک صرف ترقی پسند سوچ رکھنے والا ہی کر سکتا ہے کہ اس تجارقی دور میں جہاں بازاروں میں ہر طرف گیسو کا بے نیام فیشن اور آنکھوں کو منہ بھر دینے والا لکچر چمکتا ہے۔ وہاں اس خالصتاً سنجیدہ رسالے کا اجراء کرتے وقت کچھ خوف و دامن گہر ہوگا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ دور کو سامنے رکھتے ہوئے آپ نے جس بہت سے ایسے مشکل کام کا بیڑا اٹھایا ہے اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی کے مترادف ہوگا۔ اس دور میں جبکہ پاکستان ایک جدید و آبادی اسٹیٹ ہے خالصتاً ترقی پسند فکر کو آگے بڑھانا ایک انقلابی قدم ہے۔ اس وقت اس چیز کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے کیونکہ ترقی پسند قوتیں اب بھی انتشار کا شکار ہیں اور ترقی پسند تحریک کی تنظیم ٹوٹ چھوٹ کا شکار ہے۔ یہ صرف آپ کی کاوش ہے کہ آپ نے ان قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔

محترم زاہد منا صاحب آپ اور آپ کے دوست تنہا نہیں ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں یہ صرف زبانی بات نہیں ہم آپ کو عمل سے ثابت کر دیں گے۔ میں ضرورت صرف میرا کوالیٹی ہے۔

بہر حال ہماری خواہش ہے کہ یہ کتابی سلسلہ ملک میں ایک بڑے ذہنی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

راولپنڈی کینٹ سے

خالد محمود

روشن خیال کے نام سے جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے وہ ایک خوش آئند قدم ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ اس کو جاری رکھیں گے یہ اتفاق بھی خوش محافت سے ہے کہ آپ کے شہر اور ملتان سے جتنے دالے ایک دفتر نامہ اعلان کے لیے راولپنڈی اسلام آباد میں نمائندگی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے ادارہ میں جو تحریر کیا ہے کہ یہ ایک کتابی سلسلہ نہیں فکری تحریک ہے تو صاحب عرض خدمت ہے کہ مجھے ایک ساتھی سے پڑھنے کے لیے آپ کا میگزین مل دیا ہے، اس میں لکھے گئے تمام مضامین بہت خوبصورت اور دلگہرا انگیزا بہت کے حامل ہیں میرے حلقہ احباب کے دیگر دوست بھی اس سے اب استفادہ کر رہے ہیں لہذا مناسب کہ جو یہ سلسلہ چلے گا۔

مزید عرض یہ ہے کہ آپ مجھے یہ سلسلہ مستقل بھیج دیں

اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کا مستقل خریدار بننے کا کیا سلسلہ ہے؟ آپ اس میں کوئی رعایت دیں گے؟

اب تو ایک جمہوری حکومت اس ملک میں نمود پزیر ہو چکی ہے آپ اس نام سے ڈیکلریشن کیلئے بھی اپلائی کر سکتے ہیں تاکہ راولپنڈی اسلام آباد سے اس پے کیلئے اشتہارات بھی دلائے جا سکیں نیز آپ کو راولپنڈی اسلام آباد میں کوئی مسئلہ درپیش ہو تو بندہ حاضر خدمت ہے۔

ضرورت پڑی تو ہم دیں گے
ہو گا تیل چراغوں کی روشنی کے لیے

ازمیر خان

پختونخواہ ملی عوامی اتحاد

آپ کے پے کا دوسرا شمارہ نظر سے گزرا ترقی پسند مکتوں کے لیے یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ اس پر جو نکتہ شروع ہوا ہے۔ مگر اس شمارے کے ادارے میں آپ نے لکھا ہے کہ انقلابی خیالات کی بنیادی شرط انقلابی فہم کا وجود ہے۔ اور جس سماج میں انقلابی طبقہ موجود نہ ہو وہاں انقلابی خیالات کا وجود ممکن نہیں ہے یہ بہت خیال میں ایک غیر سائنسی بات ہے اس لیے کہ نظر یہ بین الاقوامی ہو گیا ہو اس کے کسی سماج میں موجود ہونے یا نہ ہونے کے لیے انقلابی طبقہ کا وجود ضروری نہیں ہے۔

بہر حال ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اس کی وضاحت کریں گے اور آئندہ اس قسم کی غلطیوں کا اعادہ نہیں کریں گے۔ ہم آپ کو تقریر دلاتے ہیں کہ اس رسالے کے سلسلے میں ہمارا ہر قسم کا تعاون حاصل رہے گا۔

جناب ازمیر خان صاحب :- روشن خیال صرف ہمارا ہی نہیں تمام ترقی پسند دوستوں کا پرچم ہے۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ آپ نے روشن خیال کا اتنی باریک بینی سے مطالعہ کیا کہ آپ کا فرمانا بالکل درست ہے کہ آج کی دنیا میں یہ ضروری نہیں کہ کسی سماج میں انقلابی فکری موجود نہ ہو بلکہ اس کی موجودگی سے مشروط ہو کر لایا ہوتا ضروری ہوتا تو بہت سے ملکوں بلور خاص افریقی ملک میں تو انقلابی نظریے کا وجود سرے سے ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔

اس ضمن میں ہمارا اور آپ کا موقف یکساں ہے۔ غلط فہمی غالباً اس لیے پیدا ہوئی کہ ہمارا پہلا شمارہ آپ کی نظر سے نہیں گزرا جس میں یہ بات دیکھ کے حوالے سے کہی گئی تھی اور اس کے لیے یہ بات اپنے دور کے حوالے سے ہی کہی تھی جو کہ انہی دنوں درست تھی۔ ہمارے حلقہ کو اگر اس کے دست سابق و سابق سے جو ذکر پڑھا ہے تو یقیناً آپ کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ ہم آپ کے ایک بار پھر مسنون ہیں کہ آپ نے روشن خیال میں اس قدر دلچسپی لی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ ہمیں اپنی رائے سے مزید فوائد دے رہیں گے

(ادخلہ)

ازاد فلسطین

ارشاد گوڑ

حق اور باطل کے معرکے میں فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے



حق اور باطل کی جنگ میں ہمیشہ فتح حق کی ہوتی ہے
فلسطین تنظیم آزادی کو دنیا بھر کے ممالک کی حمایت حاصل ہو جائے اس کا ہوتے ہے کہ ان کی لڑائی حق کی لڑائی ہے۔ باطل کی طاقت حق کے سامنے کتنی کمزور ہو رہی ہے۔ اس کا ہر اس بات سے چلتا ہے کہ امریکہ اس فلسطینی تنظیم آزادی کے لیڈروں سے بات چیت کے لیے راجی ہو گیا ہے گو گذشتہ دنوں میں وہ دہشت گرد تنظیم قرار دیتا رہا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ۱۹ دسمبر کو فلسطینی تنظیم آزادی کے لیڈر یاسر عرفات نے کہا تھا کہ وہ پانچ سال کے اندر ایک آزاد فلسطینی مملکت کے قیام میں یقین رکھتے ہیں اور دسمبر کو قیامی تہواروں کو تسلیم سے واپس نہ ملے گا۔ ان کے یہاں وہ پانچ سال میں آزاد فلسطینی مملکت کے قیام کے خواب کو سرخروہ تعبیر کرنے کے لیے پوری طرح سے سیاسی و مالی حمایت حاصل کر رہے ہیں۔ بھارت میں متحدہ کونسل کی چار روزہ سربراہ کانفرنس کے اختتام پر جاری شدہ اعلامیہ میں ناوا لیتہ دو غیر ممالک سے بھی اہل کی گئی کہ وہ پی۔ ایل۔ او۔ فلسطینی تنظیم آزادی کی بھرپور حمایت کریں۔

جہاں تک امریکہ اور فلسطینی تنظیم آزادی کے مابین بات چیت کا سوال ہے، اس پر طرح طرح کی قیاس آرائیوں کی جا رہی ہیں جبکہ یاسر عرفات اس سلسلے میں کافی پراسید ہیں ان کا کہنا ہے کہ بات چیت صحیح سمت میں چل رہی ہے۔

امن اور دہشت گردی

امن کے لیے ہونے والی جدوجہد کو دہشت گردی اور دہشت گردی کو امن کے لیے ہونے والی جدوجہد قرار دیے جانے کی بات تھی نہیں ہے اور چونکہ ان دونوں قسم کے کاموں کو تعین ذاتی یا طبقائی بنیاد پر ہوتا ہے اس لیے اس سلسلے میں صحیح فیصلہ عوام کا ہی ماننا جاتا ہے عوام کے فیصلے میں عموماً کافی وقت لگ جاتا ہے اور چونکہ عوام بھی طبقائی نظریہ سے مبرا نہیں ہیں اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ جو تحریک عوام کے حق میں ہوتی ہے وہ دہشت گردی نہیں بلکہ امن کے لیے ہونے والی جدوجہد ہے۔ تاہم یہ کہ عوام کا مفاد امن میں مضمر ہے نہ کہ جنگ میں تقریباً یقین دہانی قابل فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی پرمیگنڈہ عروج پر تھا اور انہیں دہشت گرد قرار دے دینا عام بات تھی خصوصی طور پر یورپی ممالک میں تو یہ رجحان بہت دن تک جاری رہا لیکن چونکہ فلسطینیوں کی لڑائی انسانی حقوق کی لڑائی تھی اس لیے روس اور مشرق وسطیٰ بلک سمیت وہ نیلے کئی ممالک نے فلسطین کی دہشت گرد حمایت کی یہاں تک کہ اسرائیل سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے۔

سب جانتے ہیں کہ اسرائیل کو امریکہ کی حمایت حاصل رہی ہے اور اس بات سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسرائیل نے

کے کاروبار پر منحصر ہے اور ظاہر ہے کہ سنجیدہ کاروبار کرنے والے حالات میں نہیں چل سکتا اس لیے اگر دنیا بھر کی طرح کی کشمکش ہو جاتی ہے تو اسکو سازگار خاتوں میں تالا لگانے کی نوبت آسکتی ہے جو امریکہ کی معیشت کے لیے ایک ناقابل برداشت صدمہ ہو گا۔ اسی وجہ سے کہ وہ روس کے ساتھ تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں یا سچیت کرنے پر بھی اس وقت راضی ہوا تھا جب دنیا بھر کے عوام نے اس کی ضرورت کو محسوس کر کے ہونے اس کے لئے مظاہرے کئے واضح رہے کہ امن کے لئے ہونے والے مظاہروں میں امریکہ بھی پیش پیش رہے ہیں۔

ازاد فلسطین

کسی بھی مملکت کے لئے پہلی شرط زمین ہے یعنی اس کے جغرافیائی خطے کا ہونا بہت ضروری ہے مملکت خلائیں یا صرف کاغذات پر قائم نہیں ہو سکتی حال ہی میں یاسر عرفات دی آگئے اور انہوں نے دی آگئے پی۔ ایل۔ او۔ امن کے سربلہ کے طور پر جناب داؤد برکت کے نام کی کچھ جوڑی، اگرچہ حکومت شریا نے جو خرابی خطے کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتی لیکن انہوں نے پی۔ ایل۔ او۔ کے لئے اپنی سیاسی اور انسانی حمایت کا وعدہ کیا عرفات شریا ہی نہیں بلکہ اسرائیل امریکہ اور اسکے حواریوں کے علاوہ دنیا کے تمام تر ملکوں کی ہمدردیاں فلسطین عوام اور ان کے کار کے ساتھ ہیں۔ آزاد فلسطین کا قیام صرف پی۔ ایل۔ او۔ کی کامیابی ہی نہیں ہے بلکہ انسانی حقوق اور بہت حد تک امن کی جدوجہد کی بھی کامیابی ہے اور اسرائیلی وزیر اعظم اسٹون شیر نے اسرائیلی ریڈیو پر جو اعلان کیا ہے اس سے بھی پتہ لگتا ہے انہوں نے مشرق وسطیٰ میں قیام امن کے لئے ہونے والے مذاکرات کو اسرائیل، امریکہ اور اتحادی طاقت کی ایک نازک آزمائش قرار دیا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ امریکہ اسرائیل تعلقات بہت مضبوط ہیں اتنے انسانی حقوق کی دہائی دینے والے امریکہ کو اسرائیل کے غیر انسانی کاموں کے لئے کئی بار وہ کام کرنا پڑا جس کی مخالفت دنیا بھر کے ممالک نے کی اسرائیل میں لیڈروں اور سپر پارٹی کے درمیان جو مخلوق حکومت بنانے کا وعدہ ہوا ہے اس بارے میں یاسر عرفات کا کہنا ہے کہ یہ معاہدہ امن کے لئے نہیں جنگ کے لئے ہوا ہے۔ اگر یاسر عرفات کی بات کو صحیح مان لیا جائے تو اس بات کا اندازہ لگا تا بھی دشوار نہیں کہ جنگ کس کے ساتھ ہو گئے حال ہی میں بغداد میں ہونے والی ایک پریس کانفرنس میں ایک سوال کے جواب میں یاسر عرفات نے کہا کہ اقوام متحدہ میں انہوں نے جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ پی۔ ایل۔ او۔ شخصی، گروہوں یا ریاستی بھی طرح کی دہشت گردی کی مذمت

فلسطینیوں پر جو مظالم کیے گئے ہیں امریکہ کی رہنمائی شامل رہی ہے اس لیے پی۔ ایل۔ او۔ سے بات چیت کرنے پر راضی ہونے کے باوجود امریکہ مسلسل اسرائیل کی حمایت کر رہا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پی۔ ایل۔ او۔ سے بات چیت کے لیے اپنی رہنمائی کا اظہار اس نے اسرائیل کے کسی مفاد کو نظر انداز کرتے ہوئے کیا ہے، روس کے ساتھ اسرائیل کے سفارتی تعلقات کی بحالی کی امریکہ کی کوششیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں امریکی وزارت داخلہ کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا تھا کہ امریکی ایجنٹ کے ساتھ روس کے تعلقات میں ایک بات غیر فطری ہے اور وہ یہ ہے کہ اسرائیل کے ساتھ اس کے رسمی سفارتی تعلقات نہیں ہیں اور ہماری رائے میں اگر روس ان تعلقات کو بحال کر لیتا تو اس سے مغربی ایشیا کے مسئلے کے حل کے سلسلے میں کافی مدد ملتی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ برسوں سے ہم روس کے ساتھ اس موضوع پر بات چیت کر رہے ہیں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ موجودہ سیاسی صورت حال میں امریکہ کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر روس اور روس کے ممالک اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کر لیتے ہیں تو وہ آزاد مملکت فلسطین کے قیام کی حمایت کرے گا۔ لیکن کچھ سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ روس اسرائیل کے ساتھ اپنے تعلقات بحال بھی کر لیتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ آزاد فلسطین کا خواہ پورا ہو جائے وجہ صاف ہے کہ امریکہ حکومت ایک سرمایہ دار نظام کی پابند ہے اس کی معیشت بہت حد تک سنجیدہ

اقوام متحدہ کی قرارداد ۵۹ میں نوآبادیاتی تسلط اور جبر و استبداد کے خلاف لڑنے کے عوام کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔

کرتی ہے لیکن انہوں نے اقوام متحدہ کی قرارداد ۵۹ کا بھی حوالہ دیا۔ جو دہشت گردی کے متعلق ہے۔ جس میں نوآبادیاتی طاقتوں اور جبر و استبداد کے خلاف لڑنے کے عوام کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ مذکورہ پریس کانفرنس میں یاسر عرفات نے کہا کہ ان کی اطلاعات کے مطابق امریکہ کے ساتھ ہونے والے پی۔ ایل۔ او۔ کے مذاکرات کو تسلیم کر کے اسرائیل ہر ممکن کوشش کرے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسرائیل جنوبی لبنان میں ایک بڑا حملہ کرنا یا کرنا منع نہیں ہے اور مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے مشکوک کردار کے پیش نظر امریکہ اور پی۔ ایل۔ او۔ کے مذاکرات کی کامیابی غیر یقینی دکھائی دیتی ہے اور دنیا بھر کے ممالک کی حمایت کے باوجود آزاد مملکت فلسطین کا قیام جوئے خیال لانے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔

چوتھی سارک کانفرنس

آئی اے رن

پاک بھارت تعلقات پورے خطے کیلئے اہمیت کے حامل ہیں

اسلام آباد میں ہونے والی چوتھی سارک کانفرنس جو کہ پاکستان میں پہلی دفعہ منعقد ہوئی گئی اقبال پارک کے باغ میں اور اہم ثابت ہوئی۔ جہاں اس نے جنوب ایشیائی ممالک کے اس فورم کی افادیت اور اہمیت کو مزید جلا بخشی وہیں اس فورم کی مدد سے خطے کے دو اہم ممالک بھارت اور پاکستان کو بھی اپنے باہمی اختلافات اور مسائل کے حل پر بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ موجودہ کانفرنس نے اس بات کی غمازی کی ہے کہ ممبر ممالک باہمی تعاون اور درپیش مسائل کے حل کے لیے مزید پیش رفت اور تعاون کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اس امر کے ساتھ ساتھ وہ رکاوٹیں بھی موجود ہیں جو کہ بنیادی نوعیت کی ہیں اور عملی میدان میں ممبر ممالک کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہیں کہ وہ ان جذبات اور احساسات کو عملی جامہ پہنا سکیں جن کا اظہار ممبر ممالک کے سربراہان مملکت اور حکومت نے یہی تقاریر میں کیا۔ لیکن اسکے باوجود سارک کانفرنس کا عمومی رخ مثبت اور خوش آئند ہے۔

یہ بنیادی نوعیت کے مسائل جو کہ تنازعات کا باعث بھی بنتے ہیں اور علاقائی تعاون جو کہ اس فورم کا بنیادی نکتہ ہے کی راہ میں رکاوٹ ہیں مختلف ہیں جس میں ان ممالک کے اندرونی مسائل ہیں جو کہ اپنے خارجی پہلوؤں کی وجہ سے ان ممالک کے درمیان تعاون کو محدود کرتے ہیں۔ بھارت جو کہ اس خطے میں سب سے بڑا ملک ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی فوجی طاقت اور صنعتی ملک ہے اور خطے میں اس طرح ایک غیر متوازن کیفیت پیدا کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے غریب ممالک جو کہ ناہموار ترقی اور دوسری معاشی و سماجی محدودیت کے اندر اپنے مسائل کے حل پر مجبور ہیں۔ لیکن رکاوٹوں کے باوجود سارک میں ہر کانفرنس کے ساتھ ان رکاوٹوں کو کم کرنے اور تعاون کا دائرہ کار وسیع کرنے کی خواہش ہے جگہ پائی ہے۔ اور یہ رجحان اس کانفرنس میں

واضح نظر آیا ہے کہ یہ ممالک مشترکہ تعاون کرنے پر آمادہ ہیں اور اسے شعوری اظہار حالیہ کانفرنس میں مزید واضح ہوا ہے۔

۱۹۸۵ میں ہونے والی ڈھاکہ کانفرنس سے اب تک ہونے والی کانفرنسوں میں ممبر ممالک نے تعاون کے دائرے کار کو وسعت دی ہے اور ان ممالک کی عوام میں بھی سارک کے حوالے سے علاقائی تعاون کی سوچ کو مزید بڑھا دیا ملا ہے۔ سارک سے زیادہ توقعات رکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں تمام فیصلے سربراہ مملکت کرتے ہیں لہذا اس کانفرنس کو پلیٹی بھی ملتی ہے جبکہ ان اداروں کے کام کی پیروی کی بھی ضرورت ہے جو کہ ان فیصلوں پر عمل درآمد کرتے ہیں اور ممبر ممالک میں اطلاعی نظام کو مزید فعال بنانے کی ضرورت بھی ہے۔

چوتھی سارک کانفرنس ایک مختصر تجزیہ

حالیہ کانفرنس میں ایک اور اہم اور محبت مند رجحان نظر آیا جو دنیا بھر میں چلنے والی مثبت سیاسی تبدیلیوں

اس وقت حاصل کی کہ جنوبی پاکستان بھارت تعلقات میں ایک اچھا موڑ آیا۔ سارک کے پلیٹ فارم سے دونوں ملکوں کے درمیان کے عظیم کوساتھ مل کر بیٹھنے اور بات چیت کا موقع ملا۔ اور باہمی اختلافات پر ایک بہتر ماحول میں بات چیت ہوئی۔ اس کو بھی یقیناً سارک کی کامیابی کہا جاسکتا ہے کیونکہ پاک بھارت تعلقات پورے خطے کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔ خصوصاً بھارتی رویے میں تبدیلی کی ایک دہرہ پاکستان میں جمہوری حکومت کا قیام بھی ہے لیکن یہ سارک کا پلیٹ فارم ہی تھا جسکی مدد سے دونوں وزراء نے عظیم کوساتھ مل کر مسائل پر اطمینان سے بات چیت کا موقع ملا۔ دوسرے اس امر کی غمازی بھی ہوئی کہ جمہوریت ہی کی مدد سے بین الاقوامی فوجی اور باہمی تعلقات کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ دونوں سربراہان حکومت کے مذاکرات

کانفرنس کا عمومی رخ مثبت اور خوش آئند ہے

سے دونوں ملکوں کے تعلقات بڑھنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ ان مذاکرات میں دونوں طرف کے متنازعہ مسائل بھی زیر بحث آئے۔ اور دونوں طرف سے اپنے اپنے مسائل رکھے گئے اور شدید تنازعہ مسائل پر مذاکرات کے علاوہ ان معاملات پر تعاون کرنے کا یقین دلایا کہ جن پر آسانی سے پیش رفت ہو سکتی ہے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں ہونے والے بین معاہدوں پر عمل درآمد سے برصغیر میں دہشت گردی کا آغاز



ہو سکتا ہے۔

جہاں اس کانفرنس سے جنوب ایشیائی ممالک کے لیے اچھے اور بہتر نتائج کھینکے کی توقع کی جاسکتی ہے وہیں موجود حکومت کے وقار میں اضافہ ہوا ہے کہ اس نے اقتدار سنبھالتے ہی ایک اہم و مہم دوری خوش اسلوبی سے نبھائی۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان اور بھارت کے درمیان کافی عرصے سے چلنے والی سرد جنگ میں کمی کی صورت حال بنی ہے جو کہ دونوں ملکوں کے عوام کے لیے یقیناً ایک اچھے مستقبل اور بہتر ماحول کی طرف پیش رفت کا باعث بن سکتی ہے۔

کا اور ایک کا ہے۔ اسلام آباد ڈیپارٹمنٹ میں اقوام متحدہ کے چارٹرڈ ویلنٹس تحریک، اسکو کی حد بندیوں کی تحریک امن کی تحریک اور جنوب شمال تعاون کے حوالے سے بھی نکات ہیں اور انکی پھر پور حمایت ہے۔ اسکے علاوہ منشیات کی روک تھام، جنوب ایشیائی بچوں اور لڑکیوں کی فلاح و بہبود کا پروگرام اور سارک سمیت اہم معاہدے جن میں ماحولیاتی آلودگی کے خاتمے کی کوشش بھی شامل ہیں۔ مثبت اور اچھے معاہدے ہیں اور ممبر ممالک کے اس رویہ کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنی ترجیحات بدلتے ہوئے حقائق کے ساتھ ساتھ کرنے کی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ سارک کانفرنس نے ایک اہم اور مثبت کامیابی



صفدر ہاشمی کی شہادت

اظہارِ احساس

دنوں میں جن تائیدیں منجھ کو ہندوستان کا اہم ڈرامہ گروپ بنا دیا۔ انہوں نے ایک سو سے زائد ڈراموں میں اداکاری اور ہدایت کاری کی۔ جب کہ ان کے تھیٹر گروپ جن تائید منجھ نے انڈیا میں پچاس ہزار سے زیادہ مرتبہ ڈرامے اسٹیج کیے ہیں۔

صفدر ایک ہدایت کار، اداکار، ڈرامہ نویس، شاعر اور گلوکار بھی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اس سمت میں لگا دیا ان کا کہنا تھا کہ ”ایک نئے انداز کے تھیٹر کو پروان چڑھانا چاہیے۔ فیکٹریوں کے گیٹوں پر، مارکیٹوں میں، ڈاک یارڈ میں، اور گھیتوں میں جا کر ڈرامے کرنے چاہئیں۔ لوگوں کو تھیٹر بالوں میں بلانے کے بجائے ان کے اپنے کام کرنے کی جگہوں پر پہنچ کر انہیں تھیٹر دکھانا چاہیے۔ صفدر کا یہ یقین تھا کہ اسٹریٹ تھیٹر انڈیا میں بڑھی ہوئی عقیدہ پرستی، درملدہ My جادو اور محجروں، پرتوہمات مذہبی، نسلی اور لسانی منافرتوں کو مسترد کرتے ہوئے ایک روشن مستقبل کی ہلک دکھاتا ہے۔ وہ پس کاٹرا اور برہمنیت سے بہت متاثر تھے۔ صفدر روایتی تھیٹر کے مخالف نہیں تھے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ اسٹریٹ تھیٹر کے ذریعے وہ اپنی بات بہت جلد اور زیادہ آسان طریقے سے لوگوں کو سمجھا سکتے ہیں۔ صفدر ہاشمی کے مشہور ڈراموں میں ”مشیان“، ”عورت“، ”سمراتھ“، ”چکا جام“، ”ہلا بول“ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ڈرامے تکنیک کے اعتبار سے اچھے ہوتے کے علاوہ معاشرے میں موجود سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کی نشاندہی بھی بہت موثر انداز میں کرتے ہیں۔

۱۹۸۸ء میں اسٹریٹ تھیٹر کی نمائندگی کرنے کی مرضی سے انہوں نے پاکستان کا بھی دورہ کیا ان کی اہلیہ مول شری ہاشمی سردار پٹیل ودیالہ میں سمجھو، ہیں۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ دونوں میاں بیوی نے محنت کشوں کی بھلائی کے لیے خود کو اسٹریٹ پلے کے لیے وقف کر دیا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ صفدر ہاشمی نے اپنے ساتھی فنکاروں کو پکارتے کے لیے خود اپنی جان کی بازی لگا دی۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ یکم جنوری کو دہلی کے قریب نازی آباد میں صفدر ہاشمی مزدوروں کو نا سب آجرت دلائے کے مطالبے کی حمایت میں ناکہ کرنے گئے تھے۔ اس ڈرامہ میں رول ادا کرنے والے لڑکوں کے گروپ میں صفدر ہاشمی کی



رخت دل باندھ لودل فگار و چلو۔ پھر میں قتل ہوا میں یار و چلو



بعض لوگ بڑی جوش شخصیت کے مالک ہوتے ہیں وہ چند لمحوں یا گھنٹوں کے لیے ملتے ہیں لیکن اپنی یادوں کے انمٹ نقوش ہمیشہ کیلئے چھوڑ جاتے ہیں۔ صفدر ہاشمی کا شمار بھی ایسے ہی چند لوگوں میں کیا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں وہ چھ دنوں کے لیے پاکستان آئے۔ ان کی پاکستان آمد کا ترقی پسند حلقوں میں بڑا جرحا رہا۔ نوجوانوں کو خصوصاً انہوں نے اپنے جوش، ولولے، علم و دانش اور من موہنی شخصیت سے بہت متاثر کیا۔

ماہ سالہ صفدر ہاشمی نے سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے انگریزی میں ایم اے کیا تھا۔ وہ دو سال تک لکچرر شپ بھی کرتے رہے، اس کے بعد دہلی میں مخری بنگال حکومت کے انفارمیشن ڈسٹر میں انفارمیشن افسر مقرر ہوئے۔ مگر ان کو یہ دونوں ملازمتیں پسند نہیں آئیں اور انہوں نے اپنے مستقبل کو محنت کشوں کے مستقبل کے ساتھ جوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ محنت کشوں میں انقلابی شعور کو عام کرنے کے لیے انہوں نے اسٹریٹ پلے کو اپنا ذریعہ بنایا اور کچھ ہی

بیوی مول تری ہاشمی تھیں۔ ڈرامہ ختم ہوتے سے کچھ ہی دیر قبل تقریباً ۳۰ افراد جو لاکھٹیوں، ہاتھوں اور سر یوں سے لیس تھے پورے گروپ پر لوٹ پڑے۔ صفدر نے اپنے فنکاروں سے وہاں سے چلے جانے کو کہا، اور خود لاکھٹیاں اور ہاتھیاں کھاتے رہے۔ اپنے فنکاروں کو پچانے میں تو وہ کامیاب ہو گئے۔ لیکن حملہ آوروں کی لاکھٹیوں اور گولیوں سے خود کو نہیں بچا سکے ان کے میں سے ایک جگر خرم آئے تھے اور خون رسنے کا سلسلہ جاری

جنازہ جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ ان کے بعد جنے کے فنکار ریز لیے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے بعد ہزاروں کی تعداد میں مرد اور عورتیں نرناک آنکھوں سے درو چھری آواز میں ”سرجی بہت بازو بھی بہت، اکتے بھی چلو رہتے بھی چلو“ کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے محبوب فنکار لکادوان کہہ رہے تھے۔

صفدر ہاشمی شہید کر دیے گئے اور شاید انہیں شہید

روشن مستقبل کا خواب شاید بہت سے رنگ ہو چکے ہوں نے کہا کہ بات دل ساننے کو تیار نہیں کے اب صفدر ہاشمی سے ہم صرف اس کی یادوں اور اس کی باتوں میں ملیں گے۔ ہم اور سرحد کے آس پار، ان کے رفیق سی۔ پی۔ آئی (ایم) کے اس بیٹے، وحدت طراز فنکار کامریڈ کی شہادت پر شک بار ہیں۔ کامریڈ ہاشمی نے دھرتی ماں کی آغوش میں اپنی جوانی سو کریمیں اور بھی مقروض کر دیا ہے۔ صفدر اور چھارا ملک ایک نہیں تھا، ہم مختلف تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے مگر ہمارے خواب ایک تھے۔ آدرش ایک تھا۔ وہ بھی تن پرست تھا اس لیے گندری گلوں میں دفن تو صورتی کو کھو کر نکال لینا چاہتا تھا۔ وہ بھی روشن خیال تھا اس لیے کراگرندہ ذہنوں اور فرسودہ روایتوں کے خلاف اپنے ڈراموں کو ہتھیار بنا کر لڑ رہا تھا۔ ہم بھی ایسے ہی فرسودہ اور گٹے مڑے نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ ہم بھی معاشرے میں برابری اور سماجی انصاف چاہتے ہیں، جہاں محبت کرنے والے جوڑوں کو سنگدلی سے انک نہ کیا جائے اور جہاں انسان عزت سے زندگی کر سکے۔ لیکن آج صفدر ہاشمی ہم سے بہت آگے نکل گیا ہے اب وہ ہمارا ساتھی ہی نہیں ہمارا رہنما بھی ہے۔ آخریں ٹوٹنے نے صفدر ہاشمی کا ڈرامہ مشین، اور واشنز گروپ نے انقلابی نعرے پیش کیے۔



۸ جنوری تجدید عہد کا دن

۸ جنوری پاکستان میں طلبہ کے دن کے طور پر ہر سال منایا جاتا ہے۔ آج سے ۲۶ سال قبل ۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں طلبہ نے ڈیڑھ کرٹیک اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی رہنمائی میں قلمی فیوں میں کمی طلبہ کے لیے ٹرانسپورٹ لائسنس بریوں اور بائس کی ہولیات کے لیے عظیم اشان مظاہرہ کیا۔ طلبہ جب محبوب کلا تھ مارکیٹ، الفین اسٹریٹ پر پہنچے تو پولیس نے پراسن طلبہ کو منتشر کرنے کیلئے اندھا دھند فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں متعدد طلبہ شہید و زخمی ہو گئے۔ لیکن طلبہ کی اس تحریک کا راستہ نہ روکا جاسکا اور انہوں نے حکومت کو چند مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔

اسی دن کی یاد میں ہر سال پاکستان بھر کے طلبہ ۸ جنوری کے شہیدوں کی یاد مناتے ہیں۔ اس دن وہ اپنے اس عہد کی تجدید کرتے ہیں کہ جب تک طلبہ اور عوام کے مسائل مکمل طور پر حل نہیں ہو جاتے ان کی جدوجہد جاری رہے گی۔

نظم پڑھو
شاعرہ برجنت
انگریزی سے ترجمہ۔

پڑھو۔ اسے شخص تم جو کہ ملک بدر ہو
پڑھو۔ اسے شخص تم جو کہ قید میں ہو
پڑھو۔ اسے گھوڑی تم جس کی عمر چلے باڈی میں گزری ہے
پڑھو۔ اسے پشیم پر گزارا کرتے والے بڑے میاں
اپنے کو تیار کرو لوگو.... ملک کی باگ ڈور سنبھالو لوگو
اے بے گھر والو۔ اپنے لیے اسکول قائم کرو
سر دی میں مٹھنے والو۔ جاؤ علم تلاش کرو۔
اے شخص تم۔ جو کھاتے سے ہو کہیں سے کتاب حاصل کرو
بہی ہمارا ہتھیار ہے۔ مددگار ہے۔ یار ہے
اپنے کو تیار کرو لوگو۔ ملک کی باگ ڈور سنبھالو لوگو۔

کرتے والوں نے سمجھا ہوا کہ وہ اس تحریک کو اس نظریہ کو آگے بڑھنے سے روک سکیں گے جس کے مشعل کو روشن رکھنے کے لیے صفدر نے اپنے جواں ہمراہ کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ لیکن اس جلوس میں موجود ہزاروں لوگوں نے خصوصاً ان گد بیوی نے جس غمزدگی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بہ بات ثابت کرتا کہ جس آدرش کے لیے صفدر نظر ہوا تھا اسے وہاں اس کے ساتھی ایک دن ضرور حاصل کر کے دیں گے۔

شہید صفدر ہاشمی کی یاد میں ایک جلسہ کراچی کی مختلف ثقافتی، ادبی اور سیاسی تنظیموں کے زیر اہتمام منعقد ہوا جس میں ”دستک“، عوامی ادبی انجمن، نیشنل تحریک، ادارہ فکر و عمل، بزم عمل و دانش اور دیگر تنظیموں سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

سائیں عزیزانہ جلسے سے جعفر سندھ، انیس ہاشمی اور جناب سائیں عزیز اللہ نے خطاب کیا۔ سیرین انہرنے ”دستک“ کی طرف سے خیالات کا اظہار کیا۔ افشار صیو جی نے صفدر کے بارے میں اپنے تاثرات پڑھ کر سنائے۔ عابدہ ترمنصور سعید کا اور نازش جاوید نے سائیں سعید کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ ناظر محمود نے اپنی ایک نظم ”فن اور فنکار“ سنائی۔

مقررین نے صفدر ہاشمی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ سماجی انصاف کی جدوجہد میں سرخ گرم اور جوان بہو کی امیرش ہی وہ گلاب پید کرتی ہے جس کے بغیر

تھا۔ ساتھی اداکار صفدر کو خون سے لٹ پت موہن بکرا اسپتال لے گئے جہاں سے ڈاکٹروں نے جے پرکاش زائن اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ رات کو جے پرکاش اسپتال سے انھیں رام موہن بکرا اسپتال بھیج دیا گیا جہاں رات۔ اربجے زخموں کی تاب نہ لا کر وہ چل بسے۔

صفدر ہاشمی کی آخری رسوم کے وقت ان کی بیوی، بھائی بہن، ساس اور ماں کے علاوہ جن تاثریہ منج کے سیکرٹری کلاؤن، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسٹ، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رہنما، ایوزنیشن رہنما دہلی کی متعدد ادبی اور ثقافتی تنظیموں کے فنکار اور ہزاروں کی تعداد میں مزدوروں، طلبہ اور ان کے چاہنے والے موجود تھے۔ سب لوگوں نے اپنے اس عظیم فنکار کو آتش چھری آنکھوں سے الوہ انکھا۔ اس سے قبل متعدد سیاسی رہنماؤں کے علاوہ چین، کوریا اور سوویت یونین کے سفارتکاروں نے بھی صفدر شہید کا آخری دیدار کیا۔

صفدر ہاشمی کا جنازہ جلوس مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے دفتر سے روانہ ہوا۔ چھو لوں سے لے کر شہید کے بھائی سہیل ہاشمی، ان کے عزیز اور ممتاز ناول نگار بھیشم سانی سمیت دوسرے فنکار جیسے ہی اٹھا کر گاڑی میں رکھنے کے لیے چلے تو وہاں موجود تقریباً دس ہزار سو گواروں کے ”صفدر ہاشمی امرتہ شہید صفدر ہاشمی کو لاں سلام“ کے نعروں سے فضا کو جگمگایا۔ میت گاڑی کے آگے سی۔ پی۔ آئی (ایم) کے ۵۰ کارکن جن میں عورتیں اور مرد شامل تھے، پارٹی کا پرچم لیے ہوئے تھے۔ گاڑی کے پیچھے مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے رہنما

متاثر صافی آئی اے رحمن سے ایک انٹرویو

نمائندہ روشن خیال

جب ایوب خان کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ پاکستان کے سب سے بڑے انگریزی اخبار کی سب سے بڑی سرخی تھی۔

سوال: رحمن صاحب آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں ملاقات کا وقت دیا۔ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہمارے ... معاشرے میں اب تک کوئی جمہوری ادارے ایک تو قائم ہی نہیں ہونے دیے گئے۔ اگر یہاں پر جمہوری قدریں فروغ پائیں گی؟

جواب: دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوری ادارے کیوں فروغ نہیں پاسکے۔ اس کی بنیادی وجہ جہاں تک میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ جماعت جس نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا وہ کوئی منظم جماعت ہی نہیں تھی۔ وہ عوام کا آہنگ تھا ایک لعرہ تھا اور اس نعرے کی توجیع مختلف طبقات مختلف طور پر اپنے اپنے مفادات کے حوالے سے کرتے تھے۔ مسلم لیگ کا سیاسی پس منظر زیادہ روشن نہیں تھا اس لیے کہ اس کی تنظیم ۳۶-۱۹۳۵ میں عمل میں آئی تھی۔ اور پانچ سال بعد اس نے لاہور ریزوروشن کے ذریعے سے پاکستان کو اپنا نصب العین قرار دیا جس کے سات سال کے بعد پاکستان معرض وجود میں آگیا۔ یہ اتنی مختصر مدت ہے کہ جس میں اگر کوشش بھی کی جاتی تو سیاسی جماعت کا ڈھانچہ تو شاید تیار ہو جاتا لیکن سیاسی جماعت کا ایک مزاج ہوتا ہے جو اس میں کام کرنے والوں کا اور رہنماؤں کا کردار بناتا ہے جو اتنے مختصر عرصے میں کوئی واضح شکل اختیار بھی نہیں کر سکتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب پاکستان بنا تو اس کی قیادت محض افراد کے ہاتھوں میں تھی ایک جماعت کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اور وہ افراد نا کافی تربیت اور نا کافی تجربے کے افراد تھے۔ مزید یہ کہ پاکستان کا قیام ایک ایسے وقت میں عمل میں آیا جب دنیا سرورجنگ کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور ایک سامراجی نظام کی جگہ ایک جلدی نوآبادیاتی نظام جنم سے رہا تھا اس کا اثر پاکستان اور تمام نئے آزاد ہونے والے ممالک پر پڑا۔ سرورجنگ کے اثرات کے تحت بہت سے نئے ملک آپس کے جھگڑوں میں الجھ گئے ایسا پاکستان ہندوستان کے ساتھ بھی ہوا اور ان حالات میں ملک کی سلامتی کے تصور نے باقی تمام ضروریات سے نظریں

ہٹا دیں یہ تمام عناصر یعنی مسلم لیگ کا ایک جماعت نہ ہونا افراد میں تربیت کی کمی، سرورجنگ کا ماحول اور غربت کے باعث اقتصادی مدد کی ضرورت نے مل کر پاکستان میں جمہوری نظام کو پھینے نہیں دیا اس کے نتیجے میں ہمارے داخلی مسائل سمجھ سے سمجھ کر ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ آج ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں ۱۹۴۹ میں تھے یعنی ہمارے پاس وفات کا کوئی ایسا خاکہ ابھی تک موجود نہیں ہے جس کو تمام اکائیاں صدق دل ساتھ قبول کریں۔ جس میں تمام قومیتوں کو سادی حقوق حاصل ہوں۔ تاکہ وہ مل جل کر ایک متحدہ پاکستانی قومیت کا تصور پیش کر سکیں۔ ہمارے یہاں جو اقتصادی عدم مساوات ہے وہ پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے، ہمارے یہاں جو شہروں اور دیہات میں معاشی تفاوت ہے وہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ہے، ہمارے یہاں موجود ان کی مشکلات میں امتنا ہو رہا ہے یہ سب مسائل جمہوری نظام نہ ہونے کی وجہ سے خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔

اب جو ہمارے ملک میں انتخابات ہوئے ہیں تو کیا اب اس کے فطری نتیجے میں جمہوری اقدار فروغ پائیں گی یا نہیں اس بات میں قطعیت سے کوئی بات کہی نہیں جاسکتی لیکن کچھ اشارے ملتے ہیں جس سے اندازے لگائے جاسکتے ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان کے عوام نے کبھی بھی آمریت کو تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے اگر مسلسل یا کسی خاص شکل میں آمریت کا تختہ نہیں الٹا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آمریت کو پسند کرتے ہیں بلکہ اس کی کٹی اور جوہ ہو سکتی ہیں خود طلب بات یہ ہے کہ پاکستان کے عوام نے ہر مرتبہ مختلف قسم کی آمریت کا آٹھ دس سال کے عرصے میں اس طرح مقابلہ کیا ہے کہ آمریت پسپا ہونے پر مجبور ہوئی ہے۔ یہی بات ۱۹۵۸ میں نہیں نظر آتی ہے جس کو روکنے کے لیے مارشل لا لگایا گیا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ ترقی پسند جمہوری حکومت سے ان کاموں کی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں جو صرف ترقی پسند قومیں ہی کر سکتی ہیں۔

یہی چیز ہمیں ۱۹۶۹ کے کچھ میں نظر آتی ہے جب عوام کے جمہوری دباؤ کے تحت ریاست کے کچھ اداروں میں تبدیلی کرنا پڑی اور الیکشن ہوئے۔ یہی چیز ہمیں ۱۹۷۷ میں کسی اور حوالے سے نظر آتی ہے اور یہی چیز ہمیں ۱۹۸۸ میں نظر آتی ہے۔ عوام کو جب بھی اپنے جمہوری حق کو استعمال کرنے کا موقع دیا گیا تو انھوں نے ہمیشہ آمریت کے خلاف لڑنے دی ہے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آمریت تو ان طاقتیں ہر دور کے اعتبار سے کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی ہیں اور ۱۹۸۸ کے الیکشن سے بھی یہ بات واضح ہوئی ہے کہ اب آمریت کا اس طرح سے دفاع کرنا ممکن نہیں ہو گا جس طرح کہ اب تک کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عوام کی خواہشات کو کوئی خاص اور واضح شکل دینا سیاسی جماعتوں کا کام ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان کے اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے حکمران عناصر ریاستی ڈھانچے پر زیادہ انحصار کرتے ہیں باقاعدہ سیاسی قوتوں کے۔ اگر اس الیکشن کے بعد سیاسی جماعتیں اپنی ان کمزوریوں پر نظر رکھیں جن کی وجہ سے وہ مشکلات میں پھنسی رہی ہیں اور اپنی تنظیموں کو درست طور پر منظم کریں اور اپنی پارٹی کے کارکنوں کو مناسب موقع دیں کروہ ملک کے معاملات کے بارے میں سوچیں، اپنی لڑنے مرتب کریں اور اپنے مقامی حالات کے مطابق لوگوں کی تکلیف دور کرنے کی کوشش کریں حکومت پارٹی کو چھوڑا بلکہ پارٹی کا کچھ عمل دخل حکومت کے چلانے میں ہو تو ایک بہتر سیاسی صورتحال پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ بھی ہے اس وقت پاکستان ایک نہایت ہی ہمہ پہلو یا بہشت پہلو بحران سے گزر رہا ہے اور اس بحران کو حل کرنا تقریباً نا ممکن نظر آتا ہے۔ جب یہ صورت ہوتی ہے تو ریاست چلانے والوں پر خاصا دباؤ ہوتا ہے۔ جمہوریت سے گریز کرنے کے لیے اگر کوئی راستہ اختیار کیا گیا تو مزید مشکلات پیدا ہوں گی جتنا جمہوریت سے گریز کیا جائے گا اسی قدر عوام میں بددلی اور مایوسی پھیلے گی۔ یہ بھی اک واضح حقیقت ہے کہ عوام کی توقعات اور خواہشات اس درجہ تک بڑھادی گئیں ہیں کہ کوئی بھی حکومت ان کو پورا نہیں کر سکتی لیکن اگر عوام کو اعتماد میں لیا جائے

کہہ ڈرائے ہیں، یہ وسائل ہیں، امکانات ہیں، جمہوریتیں ہیں، عہدیں ہیں اور پچھلے بین الاقوامی معاملات کی پابندیوں میں زینتی قومی اتفاق رائے کے ذریعے شکل حالات پر قابو پا جا سکتا ہے۔ اس وقت دنیا میں کچھ امن کی فضا بنائی جا رہی ہے۔ پاکستان پر غیر ملکی پاور بلاک کا دباؤ کم ہو رہا ہے۔ اب ایک امکان پیدا ہوا ہے کہ جمہوری اداروں کو کچھ استحکام حاصل ہوگا۔

سوال۔ رجمن صاحب انتخابات کے جو نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں اس سے ایک پہلو یہ ابھر کر سامنے آیا ہے کہ جمہوری طور پر پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی ہے لیکن کچھ مبصرین کا خیال یہ ہے کہ اس سے قومی حقوق کی جدوجہد پیچھے جائے گی۔ سندھ اور پنجاب کے جو نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں اس کو نظر میں رکھیں اور ہمیں بتائیں کہ کیا واقعی ایسی صورتحال پیدا ہوئی ہے؟

جواب۔ گذشتہ کئی برسوں کی آمریت کی وجہ سے پاکستان کی مختلف قومیتوں میں اپنے شخص، اپنے سیاسی اور سماجی حقوق کا احساس بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات اس لیے نہیں ہے کہ پاکستان بنیادی طور پر ایک کثیر القومی ریاست ہے۔ وفاق کا قائم رہنا اس کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہ ملک ایک وفاق کی صورت میں ہی قائم ہو سکتا ہے کسی اور دوسری صورت میں نہیں ہمارے یہاں بدقسمتی سے ۱۹۵۸ء سے پہلے بھی جب ایک بڑا مشرہ پارلیمانی نظام تھا اس وقت بھی مختلف مفادات کے نتائج رہنے کی وجہ سے حکمرانوں نے کبھی حقیقی طور پر وفاق چلانے کی کوشش نہیں کی وفاق کے نام پر ایک وحدانی طرز حکومت کو جاری رکھا گیا۔ وحدانی طرز حکومت کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف علاقوں کے مسائل بڑھتے چلے گئے اس تاریخ کو دھڑلے کی ضرورت نہیں ہے لیکن گیارہ سالہ ڈکٹیٹر شپ کا جو دورہ گزرا ہے اس میں ہماری ریاست کا نظام پہلے سے کہیں زیادہ مرکزیت کا شکار ہو گیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف قومیتوں میں شدید احساس محرومی پیدا ہوئی۔ محرومی کا احساس اس لیے پیدا ہوا کہ قومیتوں کے حقوق غصب کیے گئے ان کی جائز خواہشات کو رد کیا گیا اور محض ڈکٹیٹر کے زور پر ایک وحدانی طرز حکومت چلانے کی کوشش کی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں ماحول بنگال کے قومیتوں کے حقوق کی تحریک نے نظر کیا پنجاب میں بھی قومیت کا احساس ابھر آیا لیکن ابھی جو ننگ پنجاب بحیثیت جمہوری اگر ہم وفاق کی صورت میں دیکھیں تو وہ محروم علاقہ نہیں ہے۔ اس مسئلے کو ہمارے بعض دوست غلط ملط کر دیتے ہیں پنجاب میں وہ لوگ محروم ہیں جو پسماندہ طبقات سے تعلق رکھتے ہیں مگر بحیثیت جمہوری جب وفاق کی کمیوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ پنجاب محروم علاقہ نہیں ہے دوسرے علاقوں کی محرومیت نہایت واضح تاریخی اور بین ہے یہی وجہ ہے کہ قومیت کے حقوق کی بنیاد پر تحریکیں چل اٹھیں۔

لیکن سوائے سندھ کے شہری علاقوں کے جہاں ہم ایک قومیت کی بنیاد پر واضح طور پر ووٹ دیا گیا، جمہوری طور پر رائے دہندگان نے انتہائی قومییتی نعروں کے مقابلے میں میاندری اختیار کی ہے۔ یہ فیصلہ بڑا واضح نظر آتا ہے کہ قومیتوں کے حقوق کا تحفظ بالکل ضروری ہے لیکن ابھی تک ہمارا وفاق پر ایمان باقی ہے اور بجائے اس کے کہ ہم وفاق سے علیحدہ یا اس سے آگے کی کوئی بات سوچیں یہ مان کا فیصلہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہم وفاق کے دائرے میں روکر قومیتوں کے حقوق کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

وہ جماعت جس نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا کوئی منظم جماعت نہیں تھی۔

آپ سو بہرحمد کے الیکشن بھی دیکھ لیں۔ پنجاب میں آخری مرحلے میں بڑی کوشش کی گئی کہ پنجاب کے عوام بھی ایسے نعروں کو تسلیم کریں کہ پیپلز پارٹی خالصتاً سندھی جماعت ہے، یا سندھ کی طاقت پر حکومت کرنا چاہتی ہے یہ نہایت ہی نامناسب تاروا اور بے جودہ بات تھی۔ پنجاب کے عوام نے جمہوری طور پر ایک وفاق میں یقین رکھنے والی جماعت کو پسند کیا۔ پیپلز پارٹی چاہے منہ چاہے اگر جمہوری طریقے پر حکومت چلائی جائے گی تو یہ ناممکن ہوگا کہ مختلف قومیتوں کے حقوق کو تسلیم کیا جائے۔ یہ صرف مارشل لاء میں یا ڈکٹیٹر شپ میں ممکن ہے کہ ان حقائق کو چھٹایا جاسکے۔ لیکن کسی جمہوری نظام میں ایسا ممکن نہیں۔ اگر آپ قومیتوں کے حقوق کو مسترد کریں گے تو آپ جمہوریت کو خیر باد کہتے ہو جمہوریتوں کے جیسا کہ پہلے بھی ہمارے ملک میں ہو چکا ہے۔

سوال۔ رجمن صاحب الیکشن میں یہ بھی نظر آیا کہ زیادہ تر سیاسی جماعتوں نے عوام کے سامنے کوئی معاشی یا سماجی پروگرام نہیں دیا یا اگر کسی پارٹی نے ایسا پروگرام دیا بھی تو وہ صرف سیاسی نعروں کی نظر ہو گیا۔ آپ اس بارے میں کچھ بتائیے کہ سیاسی پارٹیوں نے پروگراموں کی بنیاد پر الیکشن کیوں نہیں لڑا؟

جواب۔ یہ صحیح ہے کہ سیاسی جماعتوں نے ایسے منشور پیش نہیں کیے جنہیں ہماری ریٹیکل رائے عامہ پسند کرتی۔ مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے انداز میں کچھ بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سیاسی جماعتیں لوگوں کے جذباتوں، خیالات اور تحریکوں کے مطابق اپنے اپنے منشور مرتب کرتی ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء میں جب الیکشن ہوئے تو وہ الیکشن ایک م. س. لاء عوامی جدوجہد کا نقطہ تکمیل تھے۔ اس وقت پورے ملک میں ترقی پسندی کی ہر چل رہی تھی جو عالمی سطح پر چلنے والی سامراج دشمن تحریک کا عکس تھی۔ ۱۹۷۰ء میں عام جماعتوں نے ریٹیکل منشور شائع کیے۔ اگر آپ چار پارٹی جماعتیں جو میدان میں تھیں ان کے منشور دیکھیں تو سب نے

صوبائی خودمختاری کا وعدہ کیا تھا سب نے قومی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کا وعدہ کیا تھا جماعت اسلامی نے زمین کی ملکیت کو محدود کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اگر ان جمہوری جماعتوں کے ۸۸ء منشور پر نظر ڈالیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب جماعتیں پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور دیگر جماعتیں ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں کچھ عورتا پیچھے آئی ہیں۔ ان جماعتوں کے پیچھے بیٹھنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ گیارہ سالہ آمریت کے زمانے میں کوئی عوامی تحریک نہیں کر سکی تھی اس لیے ان جماعتوں نے اپنا اپنا کام کرنے کی بجائے حالات پر تنگ کیا دوسری وجہ یہ تھی کہ سیاسی

جماعتوں کا خیال تھا کہ پاکستان ایک آزاد ملک نہیں تھا جو کہ لقیہا نہیں ہے اس لیے وہ زیادہ ریٹیکل نعروں کے سیاسی عمل کو خطے میں ڈالتا نہیں چاہتے تھے غالباً اسی لیے ان جماعتوں نے بعض سمجھوتے کیے الیکشن کے دوران صورت حال البتہ تبدیل ہو گئی۔ عوام نے سیاسی جماعتوں سے زیادہ سوچ بچار کا تقاضا کیا۔ عوام نے فیصلہ کیا کہ انتخابات کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ اقتدار آمروں سے چھین کر عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے۔ یہ ایک سیدھی اور صاف تقسیم تھی۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو رول فیڈل کی باقیات کو جاری رکھا چاہتے تھے جب کہ دوسری جانب وہ لوگ تھے جو ان باقیات کو منساکار اقتدار عوام کے نمائندوں کو منتقل کرنا چاہتے تھے۔ عوام نے ایک فتح حاصل کی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ انتخابات ہو گئے ہیں اور اب منشور کی لڑائی آئندہ انتخابات میں ہوگی۔

سوال۔ آپ کے خیال میں کیا اقتدار پوری طرح عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیا گیا ہے؟

جواب۔ یہ تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ اقتدار پوری طرح عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ حکومت نے اپنے اور دیگر چوری حقوق تو دیے مگر نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طاقت اب بھی ایسے عناصر کے ہاتھ میں ہے جو جمہوری روایات کے تابع نہیں ہیں۔

سوال۔ تو پھر ایسی صورت حال میں ترقی پسند قوتوں کو اقتدار کی مکمل منتقلی میں کیا کردار اکرنا چاہیے؟

جواب۔ یہ ضرورت حال نہیں ہے۔ ترقی پسند ہوں یا جمہوریت پسند انکا ہمیشہ ایک ہی کردار ہوتا ہے۔ وہ جمہوریت نظر کی حمایت کرتے ہیں اور اس کی کجروی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نشاندہی کرتے ہیں وہ ایسا رویہ نہیں اختیار کرتے جس سے جمہوریت کو نقصان پہنچے۔ اس کی ایک مثال دونوں ۱۹۷۷ء جب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف جہ پل رہی تھی تو بہت سے لوگوں کی نظر سے یہ اصول اوجھل ہو گیا تھا۔ انھوں نے بھٹو صاحب کی مخالفت میں ایسا رویہ اختیار کیا جس نے انہیں مارشل لاء کے کامیوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ پی پی کی حکومت خالص جمہوری انداز

سے نہیں چل رہی تھی۔ بہت سی ایسی باتیں تھیں جو ناجائز تھیں۔ لیکن وہ حکومت مارشل لاء سے بدچل رہی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ بنا پر تاسا ہے کہ بہت سے سیاسی لیڈران تھے، متوسط طبقے تھے اور بہت سے دانشوروں نے اپنی تشہیر کو مخالفت کی حد تک بڑھا دیا۔ یہ خطرہ اب بھی موجود ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کے ترقی پسند ہر جمہوری طاقت سے ان تمام کاموں کی توقعات والہ تھے کہ جیسے ہیں جو صرف ترقی پسند قوتیں ہی کر سکتی ہیں اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ سماجی تبدیلی کا عمل نہ تو صرف معروضی حالات سے ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کی عطا کردہ حمت سے ہو سکتا ہے۔ وہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب حالات کا صحیح تجربہ کر کے ترقی پسند قوتیں اپنے آپ کو اتنا مضبوط اور مستحکم بنائیں کہ وہ تبدیلی کا کامل مکمل کر سکیں اپنی خواہشات کو ایک طرف رکھتے ہوئے جمہوری اور ترقی پسند عناصر کا فرق بناتا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں بجائے شاس کے کہ اپنی خواہشات کے مطابق دوسروں کے کردار کا محاسبہ کریں۔

سوال: ملک میں جب تک بنیادی تبدیلی نہ ہو مسائل حل نہیں ہو سکتے آپ کے خیال میں یہ موجودہ حکومت کس حد تک بنیادی تبدیلی لاسکے گی بصورت

جماعتوں کو دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاشرے کی ترقی کا دارومدار فکری ارتقاء ہوتا ہے قوم میں فکری تبدیلیاں پیدا کرنا معاملات کو نکال کر دیکھنا اور ان کو نبھانے سارے کاسدار کا سیاسی جانتیں نہیں کر سکتیں۔ حقیقت دراصل یہ ہے کہ معاشرے میں جب تک بعض بنیادی باتیں بہت مشکل کر سکتے ہیں آئیں گی اس وقت تک ایک فکری تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

لوگوں کے سامنے مقابل نظر ہے حیات واضح طور پر آتا رہنا چاہیے۔ ان متبادل نظریات سے ہی سیاسی حکمت عملی پیدا ہوتی ہے یعنی یہ سمجھنا کہ ہم زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ زندگی اور دنیا کا ایک مبسوط منظر نامہ تشکیل کرنا اور پھر اس میں اپنے مقام کا تعین کرنا۔ پاکستان کے اندر جو اکائیوں رہتیں ہیں جو طبقات رستے ہیں اور جو اونچے نیچے ہیں اس کا تجربہ کر کے ایک فکری عمل کا ایک سائنسی لاٹھ عمل طے کرنا آج کے وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ کام سیاسی جماعتوں سے آگے بڑھ کر ترقی پسند عناصر کو جاری رکھنا ہے جو کہ انہوں نے ابھی تک نہیں کیا ہے۔

پاکستان کے عوام نے کبھی آمریت کو تسلیم نہیں کیا

سوال:۔ رحمن صاحب اب کچھ دوسری طرف آتے ہیں۔ پچھلے گیارہ سالہ فوجی آمریت میں میڈیا کو کس طرح سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

جواب:۔ میڈیا ۱۹۵۸ء سے ۱۹۸۸ء تک ایک ہی طرح استعمال کیا گیا ہے۔ پہلا کام آمرانہ حکومتیں یہ کرتی ہیں کہ وہ میڈیا کے بارے میں بہت خصوصی اختیارات حاصل کر لیتی ہیں۔ اب اس کی مثال یہ ہے کہ ایوب خان صاحب نے پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس نافذ کیا۔ سہنا پڑو کر فک ایکٹ لگایا، ٹیلی ویژن سرکاری تسلط میں قائم ہوا، ریڈیو ریاستی کنٹرول میں تھا نیشنل پریس ٹرسٹ بنا دیا گیا، اور A.P.P کو حکومت کے قبضے میں لے لیا گیا۔ اس طرح سے کھنچے، بڑھنے، سستے اور دیکھنے کے تمام ذرائع جنہیں ہم ذرائع ابلاغ کہتے ہیں ان پر حکومت کی ہمارہ دہری قائم ہو گئی آمرانہ حکومتیں دوسرا کام یہ کرتی ہیں کہ ان تمام ذرائع ابلاغ کو صرف ہر ویگنڈے کے لیے مخصوص کر دیتی ہیں یہ طریقہ ہمیں بلکہ حقیقت ہے کہ ایک دن میں ایوب خان کی دس دس تصویریں ہر اخبار میں چھپتی تھیں۔ ایوب خان صاحب نے یہ فرمایا، صدر صاحب نے وہ کہا، وزیر چلتا رہتا تھا آئینہ چیز جو ہے وہ یہ کہ تمام ملک میں جو ثقافتی تنوع اور رنگارنگی ہے اس کو وہاں ایک فرضی قسم کی مرکزیت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ کسی فیکٹری،

دیگر ملک کس قسم کے بحران سے دوچار ہو سکتا ہے؟ جواب:۔ ابھی یہ دیکھنا ہے کہ حکومت تبدیلیاں لاتی ہے یا نہیں لاتی ہے۔ اگر لاتی ہے تو یہ سوال ہو گا کہ تبدیلیاں کافی ہیں یا کافی اور اگر حکومت تبدیلیاں نہیں لاتی تو اس بات پر اختلاف ہو سکتا ہے کہ وہ لانا نہیں چاہتے یا لانا نہیں سکتی۔ اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ حالیہ الیکشن میں بایں بازو کو بھی دائے... جنڈکان نے مسترد کیا ہے۔ یہ بات صدق دل سے تسلیم کرنی چاہیئے۔ مجھے اس میں کوئی تعجب نہیں ہے۔ عوام اپنے معروضی حالات، علم اور اپنے تجربہ کی بنیاد پر تجربہ کر رہے ہیں۔ اگر ترقی پسندان کی مدد کرتے، ان کو بہتر تجربہ کرتے ہیں مدد دیتے تو ممکن تھا کہ وہ ان مسائل کو زیادہ گھٹکا لے کے قابل ہو سکتے۔ اب یہ بھی ہو گا کہ اگر مسائل حل نہ ہوئے تو حقیقی طور پر متنبی... قوتیں ابھریں گی مثلاً انتہا پسند تشدد کی تحریک، انتہا پسند قوم پرستی کی تحریک، انتہا پسند ذات برادری کی تحریک، انتہا پسند ایٹو وچیزم جو کلاس کے حوالے سے کی جاتی ہے جن کا مظاہرہ تاریخ میں دیکھ چکے ہیں جو لوگ صحیح تبدیلی پر ایمان رکھتے ہیں یا تبدیلی کے صحیح تقاضوں کو سمجھتے ہیں۔ وہ لوگوں کی تربیت کرنے کے لیے میدان میں آئیں۔ جس حد تک وہ لوگوں کو تعلیم پہنچائیں گے اس حد تک تبدیلی کی خواہش کا رخ مختلف ہو سکتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ساری باتوں کا الزام یہ

میں فاشنگ ہو اور اس میں دس آدمی مر جائیں تو یہ اخبار کی سرخی نہیں بنتی۔ میں آپ کو ایک واقعہ بتا رہا ہوں کہ جب ایوب خان کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ پاکستان کے سب سے بڑے انگریزی اخبار کی سب سے بڑی سرخی تھی۔ میڈیا کو اشرف کا ایک طبقہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حکومت کے مخالفوں کے بارے میں کوئی خبر نہیں دی جاتی، ان کے وجود سے انکار کیا جاتا ہے اور ان کے نقطہ نظر کو بلیک آؤٹ کیا جاتا ہے بلکہ تو یہ ہے کہ اگر عدالت ان کے حق میں کوئی فیصلہ کرے تو اس کی خبر بھی نہیں دی جاتی۔ لوگ پکڑے جاتے تھے۔ ان کی گرفتاری کی خبر نہیں چھپ سکتی تھی۔ لوگ عدالتوں میں دعوے کرتے تھے لیکن اس کی خبر نہیں چھپ سکتی تھی جو کچھ گیارہ سال میں ہوا اس کی تو مثال ملنا بہت مشکل ہے۔

ایلائے کو سرکاری مداخلت کے علاوہ بھی کنٹرول کیا جاتا ہے مثلاً میرا یہ یقین ہے کہ حکومتیں... پاکستان کے عوام کو جا بھل رکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے وہ تعلیم کے فروغ میں پیچھے نہیں تھیں وہ نہیں چاہتیں کہ لوگ زیادہ اخبارات پڑھیں اور آزاد ذرائع ابلاغ سے متاثر ہوں۔ اب اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر پندرہ... زر تلافی دی جاتی ہے لیکن پینشننگ ہر نہیں ہے مشینیں ہنگی ملتی ہیں۔ کاغذ مہنگا ملتا ہے اور روشنائی مہنگی ملتی ہے۔ ابلاغ عامہ کو فروغ دینے کے لیے حکومت ان کو سستا کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ وہ نہیں چاہتی یہ ذرائع عوام کے ہاتھوں میں پہنچیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ ابلاغ کے اختراعات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ کاروبار صرف بہت بڑے سرمایہ داروں کی حد تک محدود ہو جاتا ہے۔ بڑی مالدارانہ داریاں جس میں ابھرتی ہے پھر کارٹیل بن جاتے ہیں یہ کارٹیل اور تقریباً ستر فیصد اشتہاروں کو حاکمیت کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ پھر ان کے مفادات ہوتے ہیں یہاں جیسے ملک میں تقریباً ستر فیصد اشتہاروں کو حکومت کنٹرول کرتی ہے وہ بس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے۔ ۱۹۷۷ء سے پہلے یہ ممکن نہیں تھا کہ حکومت کھلے طور پر اعلان کرے کہ یہاں ہر قسم کے اشتہارات دینگے یہ حق بھی جرنل فیاض صاحب کی آمریت کا ہے کہ حکومت بیلنگ دھل اعلان کرے کہ جو حکومت پر تنقید کریں گے ہم ان کو اشتہار دیوے دیں گے۔ خدا خدا سی بات پر اخبارات کے اشتہارات کم یا ختم کر دیے گئے۔ اخبارات اور اشتاعتی ادارے اس قسم کا دباؤ برداشت نہیں کر سکتے وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ حکومت کی ہال میں ہاں ملائیں۔ یہ اتنی طویل داستان ہے کہ اگر لکھا جائے تو ہاٹ یا بلیک پیپر کی کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

سوال:۔ رحمان صاحب پچھلے حکومت غلام اسحق خان نے پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس کی جگہ جرنل

آف پریس پبلیکیشن آرڈیننس نافذ کیا ہے۔ اس سے کیا کچھ فرق پڑا ہے۔ کیا اب مزید صحافتی آزادی کی توقع کی جاسکتی ہے؟

جواب:- دیکھئے ۲۰۲۰ء کے باب میں تو میا الحق صاحب اپنے ہی دام میں جھنس گئے انھوں نے ایک شریعت کورٹ بنائی شریعت کورٹ نے فیصلہ کر دیا کہ یہ پابندیاں غلط ہیں۔ وہ اسے ختم نہ کرتے تو یہ خود ہی ختم ہو جاتا۔ حکومت نے اس مشکل میں اپنے آپ کو پا کر ایک نیا پریس لاء بنا دیا۔ میرے نزدیک یہ پریس لاء ہے ہی غیر ضروری۔ یعنی کسی قسم کے پریس لاء کی ضرورت نہیں ہے۔ تو جب حکومت اس حقیقت سے انکار کرتی ہے اور کسی قسم کا پریس لاء بناتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں وہ اپنے لیے کچھ دخل در معقولات کی راہ نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ نیا پریس لاء پہلے سے بلاشبہ بہت بہتر ہے اس میں آزادوں کا دائرہ بڑھ گیا ہے۔ لیکن حکومت نے بہت سے ایسے اختیارات بھی اپنے پاس رکھے ہیں جس کے ذریعے آزادی اظہار پر ضرب لگانا ممکن ہو سکے گا۔ البتہ چند دنوں میں جو دیکھنے میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک جو بریلی روایت محکمہ پبلیکیشن دیا نہیں جاسا تھا تو وہ روایت اب لوٹ گئی ہے۔ بہت سے نئے پبلیکیشن دیے گئے ہیں۔ اس کا لکنا فائدہ ہو گا، یہ میں ابھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ گزشتہ تین برس سے جو پالیسی رہی ہے اس کا بہت بھاری نقصان ہو چکا ہے اس لیے کہ اگر تین برس پہلے یہ آزادی دی جاتی تو تھوڑے سے سرمائے سے بھی اخبارات نکالے جاسکتے تھے۔ آج آزادی

ایسے دور میں دی جا رہی ہے جب کم سرمائے سے اخبار نکالنا ممکن نہیں رہا۔ اگر یہ پریس کی آزادی برقرار رہتی تو ممکن ہے کہ کچھ اخبارات اپنے آپ کو اب تک جا چکے ہوتے۔ اب اس افیلہ زمر کے دور میں اخبارات نکالنا بہت مشکل کام ہے آپ یقین مانیے کہ بہت سے لوگ اخبار نکالنا چاہتے ہیں لیکن وہ نکال نہیں سکتے۔ اور جو اخبار تجرباتی طور پر نکلیں گے ان کی عمر بہت کم ہوگی۔ اس لیے کہ ان کا مقابلہ بہت سے جمائے اداروں سے ہوگا۔ یہ آزادی ایک طرح سے یوں ہے کہ ایک ذریعہ کو خوب اچھی طرح سے تیار کر کے میدان میں اتارا جائے اور پھر کسی سے کہا جائے کہ اب آپ ان سے قیمت آزمائیں۔ اگر حکومت چاہے کہ ادارہ آسانیاں پیدا ہوں تو اس کے لیے اس کو کچھ اور مثبت اقدام بھی کرنے پڑیں گے۔ اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ پورے ملک میں پبلیکیشن کے کارڈار کو فروغ دیا جائے، مشینوں کی قیمتیں کم کی جائیں چھپائی سے متعلق اشیا کی قیمتیں کم کی جائے آزادی کے تحت کو سب میں مصفاہ طریقے سے تقسیم کیا جائے حکومت اپنی آستیاں ان کی اجارہ داری کو استعمال نہ کرے۔ اگر یہ سب کچھ ہو تو بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔

سوال:- افغانستان کی موجودہ صورتحال جو اثرات ہمارے ملک پر مرتب ہو رہے ہیں اس پر کچھ روشنی ڈالیں؟

جواب:- افغانستان میں مداخلت کرنے کی پاکستان نے بہت بھاری قیمت ادا کی ہے۔ بلکہ ادا کر رہا ہے۔ اور معلوم نہیں کب تک ادا کرتا رہے گا۔ لیکن میرا

یہ خیال ہے کہ یہ مسئلہ اب جلد کسی نہ کسی کروٹ بیٹھنے والا ہے۔ اس کے بعد ہماری یہ کوشش ہو گی کہ ہمارے افغانستان سے براہ راست تعلقات استوار ہوں افغانستان میں ایک جمہوری حکومت قائم ہو ایسی حکومت قائم ہو جو سماجی تبدیلی پر ایمان رکھتی ہو۔ اس لیے اگر افغانستان میں جو پریس تو پاکستان پر اس کے اثرات مرتب ہوتے رہیں گے۔

سوال:- آخری سوال یہ کہ سوویت یونین میں فٹی... تبدیلیاں آ رہی ہیں اس کا خود سوویت یونین کے اندر اور بین الاقوامی سیاست پر کس قسم کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

جواب:- اس سوال کا جواب تو نہ سوویت ماہرین دے سکتے اور نہ بین الاقوامی ماہرین کہ آئندہ کیا ہوگا۔ لیکن جو بات دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ سوویت یونین نے طویل عرصے کے نظر یا قے جمود کے بعد اپنی کچھ دلائیں کھولنے کی کوشش کی ہے۔ ابھی سب تجرباتی مراحل میں ہے۔ یہ تجربات کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں اور کہاں ان میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یہ آئے والا وقت بتائے گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ سوویت یونین کے ان تجربات کا اثر ساری دنیا کی سیاست پر پڑ رہا ہے اور یقیناً ہمارے ملک اور خطے کی سیاست پر بھی پڑے گا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر جنرل سید قریب گورباچوف کی پالیسیوں کے نتیجے کے طور پر ہمارے خطے میں جنگ تشدد اور محارہ آدھے کم ہو جائے تو اس سے ہماری ملکی سیاست میں بھی کسی حد تک مثبت تبدیلیاں وقوع پذیر ہوں گی۔



فتوے

حبیب جالب

امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے نہیں ہے دیں فرد شو! ہم یہ یہ کوئی نیا فتوے سفینہ اہل زر کا ڈوبنے والا ہے شب زادو کوئی فتوے بچا سکتا نہیں جاگیہ داروں کو بہت خوں پی چکے ہو اپنا بھی انجام اب دیکھو تمہاری حیثیت کیا کون ہو تم اور کیا فتوے امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے

رضائے ایزدی تم نے کہا ”دین الہی“ کو نہیں مٹنے دیا تم نے ظلم کجکلاہی کو دیا تم نے ہمارا ہر قدم پر زاریں کو مگر ان نیت کے سامنے کس کا چلا فتوے امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے

کہا تم نے کہ جائز ہے فرنگی کی وفاداری بنایا تم نے ہر اک عہد میں مذہب کو سرکاری لیے پرمٹ دیے فتوے رکھی ایوب سے یاری دکان کھولنی بجاؤ پانا ہو چکا فتوے امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتوے

رومانیت

حین مکری

اسے خدا تیری مخلوق تیرے ہاتھوں سے کب نکل سکی اب تک ڈیڑھ لاکھ بیویاں نے ذہن کے کوڑوں پر کتنی دنگیں دی تھیں کتنی آہیں کی تھیں سوچ کے سمندر میں کتنی چھلیاں پیٹیں کتنی چھلیوں کی لاشوں پر آج بھی ہے جگمگا باطنی احتیاج سفر خارجی منزلوں کے بغیر آج بھی لوگ طے کر رہے ہیں اپنے قدموں تلے اپنے خود ساختہ بوجھ سے مر رہے ہیں

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا وزیرِ اعظم کون ہوگا؟ مرد یا عورت؟



ان دونوں میں

آدرش کا فرق کوئی فرق نہیں!
 جمہوریت دوستی اور جمہوریت دشمنی کا فرق بے معنی ہے!
 سیاسی کردار اور مسلک کا موازنہ غیر ضروری ہے!
 کیوں؟
 اس لیے کہ:
 انسانوں کے درمیان جنس کے علاوہ ہر فرق باطل ہے۔
 بنیادی مسئلہ عورت یا مرد ہونا ہے، انسان دوست یا انسان دشمن نہیں۔
 چنانچہ:
 عوامی مقبولیت یا انتخابی فتح کی بنیاد پر کوئی عورت ملک کی جمہوری سربراہ نہیں ہو سکتی۔
 یہ ہے:
 پاکستان میں مذہبی بنیاد پرستی کا نایہ تازہ جوہر۔

سرسید احمد خاں پر کفر والحد کا فتویٰ

سرسید احمد خان کا خیال تھا کہ مسلمانان ہند کی نجات و ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ مغربی تعلیم و تہذیب کو اختیار کریں اور سائنسی نظریہ پرائیں۔ ان کا راسخ عقیدہ تھا کہ ان باتوں سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ مسلمانوں کے ایمان میں خلل آئے گا۔ اسی غرض سے انہوں نے علی گڑھ کالج قائم کیا اور ایک رسالہ تہذیب الاخلاق کے نام سے جاری کیا۔ روشن خیال مسلمانوں نے سرسید کی کوششوں کو بہت سراہا لیکن مولویوں کا بڑا گروہ ان کے خلاف ہو گیا اور ان پر کفر والحد کے فتوے کی بوجھا ہوئی گئی۔ چنانچہ مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ:

ہو! فتویٰ بھی حسین شریفین کے مفتیوں نے لکھا۔
یہ مدرسہ جس کو خدا بر باد اور اس کے بانی کو ہلاک کرے اس کی اعانت جائز نہیں ہے۔ اور اگر مدرسہ بن کر تیار ہو جائے اس کو منہدم کرنا اور اس کے بانی سے اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے اور ہر شخص جس میں حجت اسلامی ہو واجب ہے اس مدرسہ کی مخالفت جہاں تک قدرت ہو اور فی وجہ یہ ہے کہ اس سے اس کا مخالف ہو۔

پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور گریہوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اس کا قتل واجب ہے۔ دین کی حفاظت کے لیے

جس زمانہ میں سرسید احمد خاں ولایت میں تھے ان کے پاس کے اخبار شعلہ طور کا بنیاد مولوی سید امداد علی کا ایک مضمون سرسید کے خلاف چھپا ہوا پہنچا تھا۔ اس میں تاریخ الفتن کا دی ترجمہ جس پر آخو کار سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لکھا گیا بیحد نقل کر کے صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ دوسرے شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسہ نامی ہے۔ سرسید ولایت سے ایک خط میں مولوی ہمدی علی خاں کو لکھتے ہیں ”دیکھو دینی آدمی

تہذیب الاخلاق کے توڑ پر خاص خاص اخبار اور رسالے جاری ہوئے، کانپور سے نورالافتاح اور نولہ لہور اور دہلی سے لوح محفوظ نکلا، اگر سے تیرہویں صدی شائع ہوا۔ اور اعلیٰ شایب شایب اور تائید اسلام وغیرہ اخلاص شال مغرب اور شعلہ اللہ پنجاب سے شائع ہوتا۔ سرسید کو خود لا تہذیب کر شان، نیچری دہریہ، کافر، دجال اور کیا کیا خطاب دیئے گئے۔ ان کے کفر کے فتوے پر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مہرین اور دستخط کرائے گئے۔ یہاں تک کہ جو لوگ سرسید کی بغیر پرستوت اختیار کرتے ان کی بھی بغیر ہونے لگی۔

مولوی عبدالحق صاحب مرحوم لکھنؤی ہو علمائے فزنگی محل میں نہایت نام آؤر وہ تھے۔ مقصد عبارت میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو شیطان اجتناب کا مضمون قلمی ہیں اور منکر اس کا شیطان ہے۔ بلکہ اس سے بھی زائد کہ جو خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں۔ اور جو آسمان مسموم قذافی ہے۔ منکر اس کا مبتلائے دوسرا شیطان ہے۔ حرمت مختلف طہر و منصوص کلام رب مغفور ہے اور سلف سے تا خلق اتفاق اس پر ثابت ہے۔ انکار اس کا موجب گمراہی و فحور ہے جو شخص کے اعتقادات اس کے فاسدہ ہیں جو کہ سوال میں مسطور ہوتے ہیں وہ شخص محض دین الیہیں لعین کے دوسرے صورت اسلام اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے۔ اور تمام تجاہد مدرسہ مجددہ افشا و تخریب اس کی منظور ہے۔

مولوی علی بخش خاں حج بیت اللہ گئے اور مکہ معظمہ جا کر مذاہب اربعہ کے مفتیوں سے فتویٰ حاصل کر کے ہندوستان آئے۔ چاروں صاحبوں کے جوابات کا ماحاصل یہ ہے کہ ”یہ شخص منکال اور مقل ہے بلکہ وہ الیہیں العین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا لہر رکھتا ہے۔ اور اس کا فتنہ ہو دو لشکر کے قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ واجب ہے اولوالامر پر اس شخص سے انتقام لینا۔ عرب اور یمن سے اس کی تادیب کرنی چاہیے۔

بعد از مولانا حالی بخش مدینہ منورہ جہاں شیخ تخرمین بابی مفتی احناف سے سرسید کے خلاف فتویٰ حاصل کیا جو درج ذیل میں ہے۔

”جو کچھ درختار اور اس کے عواشی سے معلوم ہوتا ہے اس کا ماحاصل یہ ہے کہ یہ شخص یا تو فحور ہے یا شرع سے کفر کی کمی جانب مائل ہو گیا ہے۔ یا زندقہ ہے۔ کہ کوئی دین نہیں رکھتا یا اتنا جی ہے کہ نہ کفر نہ کھلا صاحب تہذیب ہے۔ اور اہل مذہب (حقی) کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توہین و تخریب کے بعد قبول نہیں ہوتی پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور گریہوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے۔ ورنہ اس کا قتل واجب ہے۔ دین کی حفاظت کے لیے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بریت کے منصوبہ علی گڑھ کالج کی تعمیر کے خلاف بھی کفر کا فتویٰ جاری

کواہی اندھا کر دیتی ہے اسی اخبار شعلہ طور) میں تاریخ ہندوستان کے مضمون کو نقل کر کے لہو و مد لکھا ہے کہ ”جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہے وہ کیسہ نامی ہے۔ حالانکہ خود بھی اس عبارت کو لکھتے ہیں پھر مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے؟ صرف اتنا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا اور اور انہوں نے اردو سے۔

یہ نرا لطیفہ ہی نہیں بلکہ اس فتویٰ کے موافق جو مفتی سعد اللہ صاحب نے اسی ترجمہ کی بابت سرسید کی نسبت دید سے مولوی امداد علی بھی تکفیر کے مفتی ٹھہرتے ہیں۔ کیونکہ مفتی صاحب اپنے فتوے کے تائید میں شفاں تا حقی حیاض سے نقل کرتے ہیں کہ امام مالک نے حکم دیا کہ ان الفاظ کا بولنے والا کافر ہے۔ اس کو قتل کر ڈالو۔ اس نے کہا حضرت میں نے دوسرے شخص کا نقل کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہم نے بھی سے نہ ہے۔

سرسید نے وٹنام طرازی۔ فتویٰ ذری کالم کوچ کا کبھی جواب نہ دیا لیکن جب جواب دیا تو ان فتویٰ بازوں و اختر بازوں کے منہ پر ایک زبردست طاپچر تھا۔ جواب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

ہم کو خدا و زندقہ اور لا مذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد و الجلال کے سوا پاپ والو کے زہم و راج کو اور اپنے قدیمی چال چین کو دوسرا خدا مانا ہے اور پھر آخر الزماں محمد رسول اللہ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں۔ کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بتایا ہے اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی سراہا کرتے والے ہیں ہمارے جڑا محمد براہیم اپنے باپ آزر کے بتوں کو توڑنے والے تھے ہم سچے خدائے واحد و الجلال اور پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ اطاعت دنیا میں قائم کرنی چاہتے ہیں پھر وہ لوگ ہم کو محمد و زندقہ والا مذہب نہ کہیں اور نہ تجھیں تو کیا کہیں تو کیا تجھیں کیونکہ ہم ان کے خدائوں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے ہیں۔

خدا وارم دے بریان برحق مصطفیٰ دارم
تدار و سچ کار دس مانے کہ من دارم

ان خوشحالی جہوریت

نیاسال مبارک

شیگان کوٹیکس
۱۶ سی بلاک ایل نار تھ نارم آباد
کراچی۔ فون ۴۲۳۸۰۱ - ۴۲۳۸۰۱

لیفٹ ڈیموکریٹک فرنٹ

نیم احمد

اور کالوں وغیرہ میں متعارف کرائیں اور اسے مقبول بنائیں۔

LDF کی جانب سے دو فردی کول بورڈ میں درکار کنونشن بلائے کا فیصلہ انتہائی مثبت عمل ہے۔ فردیت اس امر کی ہے کہ اسی طریقہ کار پر عمل کرتے ہوئے ملک کے تینوں صوبائی دارالحکومتوں میں بھی عوام کے مسائل پر جلسے کیے جائیں تاکہ یہ اتحاد ملک بھر کے عوام کو عملی طور پر ایک ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہو سکے۔

یہی موجود ہے جبکہ بائیں بازو کا کوئی متبادل عوام کے سامنے نہیں ہے۔ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ ایل ڈی ایف دیگر بائیں بازو کی اور جمہوری جماعتوں کو بھی اس اتحاد میں شامل کرے اور عوام کے سامنے عملی جدوجہد کے ذریعے ایک مضبوط متبادل پیش کرے۔ یہ ضرورت اس اتحاد میں شامل تمام جماعتوں کی بنتی ہے کہ وہ ایل ڈی ایف کے پروگرام کو عوام کے وسیع ترین حصوں یعنی طلبہ، مزدور

لیفٹ ڈیموکریٹک فرنٹ (LDF) کا قیام اکتوبر ۸۸ء کو کلکتہ میں کیا۔ بائیں بازو اور جمہوری قوتوں کا یہ اتحاد تقریباً ایک سال کی گفت و شنید اور مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد عمل میں آیا۔ حالیہ انتخابات سے کچھ ہی دن پہلے قائم ہونے کے باعث "ایل ڈی ایف" ایک اتحاد کے طور پر اس میں حصہ نہیں لے سکا۔ مگر انتخابات کے بعد اس کا کردار اور بھی زیادہ اہم اس لیے ہو گیا ہے، کیونکہ ملک میں پولیز پارٹی کے متبادل کے طور پر صرف دائیں بازو کا اسلامی جمہوری اتحاد

پاکستان ایک کثیر الطبقاتی ریاست، مختلف قومیتوں کا وطن اور کثیر الثقافتی سماج ہے۔

۱۔ پاکستان میں فوج کے سامراجی کردار کو ختم کرنے کے لیے فوج جو دوسرے ممالک میں سامراجی مفادات کی نگہبانی کے لیے متعین کی جاتی ہے اس کی تعیناتی کو ختم کروایا جاسکے۔ فوج کے ملک کے اندر سیاست اور معیشت میں اثر و رسوخ کو عملاً ختم کروانے کے لیے ضروری ہے کہ فوج کے زیر اہتمام قائم ہونے والے تمام صنعتی، تجارتی اداروں کو ان کی تحویل سے لے کر وزارت صنعت کی تحویل میں دیا جائے۔ نیز فوجی بجٹ میں اور فوج کی تعداد میں کمی کی جا سکے اور فوجی بجٹ اور اس کے اخراجات کو پارلیمنٹ سے منظور کروایا جاسکے۔ اور ایک قومی فوج کے لیے تمام قوتیں سے فوج بھرتی کی جائے۔

۲۔ وفاقی پاکستان، جو ایک کثیر الثقافتی ریاست ہے یہاں قومی جبر، قومی نامبرائی اور قومی استحصال ہیں وفاق کی مختلف قوموں کے درمیان جو تضاد و تصادم پیدا کیا ہے اس سے نہ صرف وفاق کی یک جہتی بلکہ اس کی قوموں کے محنت کش عوام کے اتحاد کو شدید نقصان پہنچا ہے لہذا ہم اپنی مسلسل جدوجہد سے ایسی پالیسیاں مرتب کریں گے جن سے پاکستان کے مختلف جغرافیائی و قومی خطوں کے عوام کو قومی جبر و نامبرائی اور استحصال سے نجات دلائی جا سکے، اور حق خود اختیاری کے اصولوں کے تحت رہنا کارندہ الحاق کو مضبوط کیا جاسکے۔ ان کے علاقوں کے اپنے وسائل دولت اور خزانہ پیداوار پر ان کا مکمل کنٹرول قائم کیا جاسکے، ان کی زبان، تہذیب و ثقافت کو مکمل تحفظ اور ترقی دی جا سکے اور انہیں ہر لہری کی بنیاد پر وفاق کے سیاسی اقتدار میں شریک رکھا جاسکے۔

۳۔ پاکستان میں ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں انتقال آبادی کو روکنے کے لیے مزدور ہے کہ پسماندہ علاقوں میں صنعتیں قائم کر کے انہیں ترقی دی جا سکے تاکہ معاشی دباؤ کے نتیجے میں انتقال آبادی کے رجحان کو مثبت طریقوں سے روکا جاسکے۔ اس کے لیے صنعتی منصوبہ بندی اس طرح کی جا سکے کہ صوبے اپنے عوام کو روزگار مہیا کر سکیں تاکہ دوسرے صوبوں میں انتقال آبادی کے سبب معاشی، سیاسی اور سماجی دباؤ نہ بڑھے سکے۔ پاکستان کو مزید معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل سے بچانے کے لیے دوسرے ممالک سے انتقال آبادی کو بھی روکا جاسکے۔

۴۔ حکومت اور ریاست کو غیر فزدارانہ بنایا جا

پاکستان میں بڑی زمین داری اور جاگیر باقیات کے مکمل خاتمے کے لیے فوری زرعی اصلاحات کی کوششیں تیز کر دی جائیں اور زمین کی حد ملکیت زیادہ سے زیادہ ۱۲۵ ایکڑ (۵۰ ہیکٹر) بوس انڈس پونٹ، فی کاشت کار خاندان مقرر کروانے کی جدوجہد کی جاسکے۔ اور اس طرح بڑے زمین داروں، سول و فوجی نوکر شاہی کو ان کی حیثیت کے صلے میں انعام میں دی گئی زمینیں واپس لی جاسکیں اور اس طرح واپس شدہ زمینوں کو مقامی بے زمین کسانوں چھوٹے کاشت کاروں میں کڑا لہ پونٹ کے معیار پر معنت تقسیم کروائی جاسکیں اور رقیہ سرکاری اور نجی ہونی اورانی پر اجتماعی کاشت کاری اور املا باہمی کے طریقے بھی اپنائے جاسکیں۔ یہ زرعی اصلاحات نوکر شاہی کے بجائے اور کھاتوں میں نام تبدیل کرنے کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے مقامی کسانوں پر مشتمل کاشت کاروں کی منتخب کمیٹیوں کے ذریعے عمل میں لائے جانے کی تدبیریں اختیار کی جاسکیں۔

۵۔ ملک کی خارجہ پالیسی کو مثبت غیر وابستگی کے صحیح مطلب و منشا کے مطابق فوراً تبدیل کروانے کی سعی کی جا سکے اور سرمایہ دار ملکوں خصوصاً امریکی سامراج سے فوجی و معاشی وابستگی کو ترک کروایا جاسکے، اور بین الاقوامی طور پر امن، مقابہت، ملک میں صحیح معنوں میں معاشی خوشحالی اور سیاسی خود مختاری کے حصول کے لیے اشتراکی، ترقی پسند اور پڑوسی ملکوں سے دوستی اور اتحاد کے راستے ہموار کیے جاسکیں۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ چین اور معاہدے، پر صدقہ دل اور ایمانداری سے عمل کروانے اور افغانستان میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کی انقلابی حکومت کو تسلیم کروانے کے لیے راستے عام ہموار کیے اور افغانستان کی انقلابی حکومت کے خلاف تحریک کاری اور تمام سازشوں کے خاتمے کے لیے موجودہ حکومت پر دباؤ ڈالا جاسکے کہ وہ امن قائم کرنے میں اپنے تختہ پوٹے سے باز رہے اور براہ راست سے افغانستان میں شہسراج کی تعمیر ہونے میں رکاوٹ کا سبب نہ بن سکے۔

۶۔ پڑوسی ممالک کے ساتھ جنگ کا ہوا کھڑا کر کے سامراج نے پاکستان کو اسلحہ کی منڈی اور ملکی بجٹ کو فوجی بجٹ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس لیے سامراج کی اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے تمام پڑوسی ممالک سے امن معاہدے کروانے کی جدوجہد کو تیز کر دیا جائے اور فوجی بجٹ میں فوری طور پر پچاس فیصد کمی کرنے کی جہم مشورہ کر دی جائے۔ موجودہ بجٹ کا تین چوتھائی حصہ اس وقت فوج پر خرچ کیا جا رہا ہے جو ہمارے جیسے پسماندہ ترقی پذیر ملک کے لیے ضروری نہیں

ہمارے ملک کی معیشت تباہ خارجی پالیسی بے وقار اور قومی خزانہ کنگال ہو چکا ہے

ادارے تباہ کر دیئے گئے ہیں، ہمارا یہ اتحاد جہاں ملک میں بنیادی حقوق، معاشی و سماجی تبدیلی کی جدوجہد کر رہا ہے، ملک میں جمہوریت کے قیام اور اس کے لیے غلط و ناجائز بنیادوں پر مصفاہ عام انتخابات جو راجدھنوری ہیں اس کے انعقاد کے لیے بھی بھرپور کوششیں کرے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جہاں وہ ملک کی تمام عوام دوست، جمہوریہ، سامراج دشمن قوتوں سے اتحاد کرے گا وہیں وہ ملک کی دیگر تمام سیاسی پارٹیوں سے ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت عام انتخابات کے لیے بھی اتحاد کر کے جدوجہد کرے گا تاکہ پاکستان میں کم از کم بنیادی طور سے جمہوری ادارے قائم ہو سکیں۔

لیفٹ ڈیموکریٹک فرنٹ

شریک سیاسی جماعتیں اور ان کے دستخط کنندگان

- ۱۔ پاکستان ورکرز پارٹی
- ۲۔ پاکستان قومی اتحاد آزادی
- ۳۔ پاکستان مزدور کان پارٹی
- ۴۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان
- ۵۔ وطن دوست انقلابی پارٹی
- ۶۔ انقلابی جمہوری پارٹی
- عابد حسن منٹو
- معراج محمد خاں
- غلام نبی کلو
- (جمال نقوی)
- (ارباب کھاور)
- (ڈاکٹر اعجاز ندیر)

بڑھتی ہوئی ہنگامی کے تناسب سے اضافہ کیا جائے۔
۱۶۔ پورے ملک میں دیگر شعبوں کی طرح صحت کے شعبے کی حالت بھی انتہائی دیگر گروں ہے اور اب تو سرکاری ہسپتالوں میں بھی مفت علاج ختم ہو گیا ہے۔ خیر ملکی دواسر کمپنیوں کی وجہ سے معیاری دوائیں تیار نہ ہونے لگی ہیں لہذا عوام کے فوری مفت علاج کا انتظام کرنے کے لیے مزید ۱۰۰ ڈسپنسریوں اور ہسپتالوں کے قائم کرنے کے انتظامات کو قائم کرنا چاہیے۔
۱۷۔ اس کے علاوہ دیگر شعبوں کے لیے قومی بجٹ میں کم و بیش فیصد صحت کے شعبے کے لیے رقم مختص کروائی جائے۔

خاندان کا انتظام کروایا جاسکے۔ تو میاں گئے تعلیمی اداروں کو مالی اور انتظامی امور میں جامعات سے ملحق کروایا جاسکے۔ میٹرک تک تعلیم مفت اور لازمی قرار دے کر مزید تعلیمی ادارے قائم کروائے جاسکیں ان مقاصد کے حصول کے لیے قومی بجٹ میں کم سے کم دس فیصد تعلیمی مدد قائم کروایا جاسکے اور تمام طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے کے بعد روزگار کی ضمانت یا بے روزگاری الاؤنس دلویا جاسکے۔

۱۸۔ پاکستان کی تمام قومی زبانوں کو قومی و سرکاری زبان کا درجہ دیا جاسکے۔
۱۹۔ دیہی علاقوں کو تعلیم، طبی امداد، صفائی، تفریح، بجلی پینے کی پانی کی سرنگوں سے اور جدید ذرائع حمل و نقل اور انہیں ترقی دینے کے مشنوں کے برابر بنانے کے انتظامات کیے جاسکیں۔
۲۰۔ تمام نجی آبادیوں کو قانونی طور پر باضابطہ بنائے ہوئے

تمام پڑوسی ممالک سے امن معاہدے کروانے کی جدوجہد کو تیز کر دیا جائے۔

۱۷۔ پاکستان کے اب تک سامراجی ملکوں سے تمام فوجی و دفاعی معاہدے ختم کئے جاسکیں۔ اس خطے میں سامراجی فوجی اڈوں کا خاتمہ اور بحریہ کو امن کا علاقہ قرار دیا جاسکے۔
۱۸۔ عالمی امن ہماری معاشی، سماجی ترقی کے لیے انتہائی اہم ہے لہذا اس خطے میں اور پوری دنیا میں دائمی امن قائم کرنے کی تحریک کا بھرپور ساتھ دینے ہوئے اس تحریک کو مضبوط بنایا جاسکے اس کے لیے انتہی ہتھیاروں کے بنانے اور استعمال پر مکمل پابندی لگائی جاسکے۔
موجودہ حکمرانوں نے ملک کی موجودہ سیاسی صورتحال کو اس قدر ناگفتہ بہ بنا دیا ہے کہ ملک میں سیاست اور سیاسی

مکان کا حقوق دیے جاسکیں، غریبوں اور بے گھر لوگوں کے لیے سرکاری طور پر بننے مکانات تعمیر کروائے جاسکیں۔
۱۹۔ شہری ترقی، منصوبہ بندی میں شہروں کے اندر اور اس کے گرد و نواح میں پرائیویٹ، دیہی آبادیوں اور شہر کے باقی حصوں کو ترقی دینے میں تمام امتیازات ختم کر کے ہونے برابر ترقی کے مواقع فراہم کئے جاسکیں۔
۲۰۔ پچھلے درجے اور اعلیٰ درجے کے ملازمین کی تنخواہوں میں جو ایک اور تین گنا فرق ہے اس کو منصوبہ بندی کے تحت انتہائی کم کیا جاسکے اور فوری طور پر مزدوروں سمیت نچلے درمیانی طبقے کے ملازمین کی آمدنیوں اور تنخواہوں میں۔

قومی ناہمواریاں ایس آئی اے اور ضیاء الحق

ک۔ و

رائے موجود تھا کہ ۱۹۷۲ء کے آئین میں قومی حقوق کا تحفظ کم ہے اور بے وقار قومی داخلی خود مختاری کو خیال رکھا جائے گا کہ جب آئین طے ہو گا تو آئین میں بھی قومی حقوق بڑھائے جائیں گے۔

مختار حکومت کے اقتدار سنبھالنے سے مختلف علاقوں کے درمیان کشیدگی کی کمی ہو جائے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قومی ناہمواریاں ختم ہو گئیں ہیں۔ ناہمواریاں سرمایہ داری کی غیر منصوبہ بند معیشت کی دین ہے اور وہ علاقوں کے درمیان اور ایک ہی علاقے میں دیہی و شہری حصوں کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ بلکہ زیادہ درست بات یہ ہے کہ سرمایہ داری میں سرمایہ بڑھتا رہتا ہے اور سرمایہ داروں کی طرف پسماندہ علاقوں اور نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں کے درمیان فرق بڑھتا جاتا ہے سرمایہ داری کی فطرت یہی ہے۔ آمریت اور جوت پرست طاقتوں کے ہاتھ میں یہ ناہمواریاں بچھوتے نفاق اور بھڑکان پیدا کرنے کا کارہی ہوئی ہیں جبکہ جمہوری حکومت میں ایسے بھڑکان کا مثبت اور پر امن حل تلاش کرنا ممکن ہوتا ہے۔ حال ہی میں بلوچستان اسمبلی کو

ملک میں عام انتخابات کے متعلق ہونے اور منتخب حکومت کو اقتدار کی منتقلی کے سبب گیارہ سالوں دور کی بچھوت۔
نفاق اور منافرت کی سیاست کو چھکا لگایا ہے، علاقائی گروہ بندی کی جگہ سیاسی گروہ بندی نے لی ہے۔ محترمہ بینیل بھٹو کا یہ کہنا قطعی درست ہے کہ جمہوری ماحول عوام کو اعتماد و اطمینان کرتا ہے۔ لوگ کھل کر اپنا نقطہ نظر پیش کر سکتے ہیں اور بحث و مباحث کے ذریعے اپنے موقف کو آگے بڑھا سکتے ہیں اس طرح جمہور میں اتحاد مستحکم ہوتا ہے۔

ضیاء الحق کے دور میں تحریک جماعتی جمہوریت (ایم آر ڈی) ملک میں سارے جمہوری رصاصوں کو توپ کی نہ کر سکی تھی لیکن پھر بھی اس نے مسائل کا نوٹس لیا اور ان کو حل کرنے کے جمہوری طریقے کو فروغ دیا۔ مثلاً ایم آر ڈی میں اس مسئلہ پر اتفاق موجود تھا کہ اگر ۱۹۷۳ء کے آئین میں کچھ ترمیم کی ضرورت ہے تو وہ آئین میں بنائے ہوئے طریقوں سے ہی ہونا چاہیے غیر جمہوری طریقوں سے نہیں۔ اس طرح اس مسئلہ پر بھی اتفاق

دی گئی جو یقیناً قابل مذمت اقدام تھا لیکن اس سے پہلے ہونے والے بھڑکان کو کمزور نہیں جمہوری حکومت کے مختار اور سچے ہونے رویہ کی بنا پر زیادہ بڑھنے سے بچایا گیا۔
حاجی انتخابات میں سندھ میں سنگ لٹھروں پرستی کو بری طرح شکست ہوئی۔ بعض حلقے انتخابات کی یہ تعبیر کر رہے ہیں کہ قومی حقوق کا مسئلہ ہی وجود نہیں رکھتا کیونکہ بینیل پارٹی کی بڑے پیمانے پر کامیابی ہوئی۔ یہ تعبیر حقائق کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ پچھلے سال سندھ کے قومی مسائل پر جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے بھٹو صاحب نے کچھ اور نام جمع کر کے سندھی عوام کو متحد کیا (ایس بی این اسے) تشکیل دیا۔ اس اتحاد میں کامیاب جام ساتی اور ڈاکٹر ارباب کھاور اس لیے شریک نہ ہوئے کہ اس وقت SPN اس کیونٹ پارٹی آف پاکستان کو شریک کرنے کو تیار نہ تھی دوئم یہ کہ ایس بی این اسے قومی حقوق کے سب دھاروں کی شمولیت کے خلاف سختی اور تیسری بات یہ کہ ایس بی این اسے ان اردو بولنے والوں کو بھی جو اس کی تائید کر رہے تھے ساتھ لینے کے لیے رضامند نہ تھے۔ اس سال کے ابتدائی ادا میں میں کامیاب جام ساتی

نے چار نکات یعنی کالا باغ ڈیم کے خلاف، بلا روک ٹوک انتقال آبادی کے خلاف، سندھ میں فوجی جھادوں کے خلاف اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لیے مختلف اور افراد اور تنظیموں کو جمع کر کے ایس این اے کو تشکیل دیا۔ اس میں پیپو اور جی ایم سید دونوں شریک تھے۔ اس محاذ میں بے ہوا کہ اس کے دروازے اس کے سارے حامیوں کے لیے کھلے ہوں گے خواہ وہ کوئی زبان بولتے ہوں۔

دوسرے اجلاس میں اس فیصلہ کو تبدیل کر دیا اور یہ پابندی لگادی گئی کہ اردو بولنے والے ایس این اے میں شریک نہیں کئے جائیں گے۔ اس غیر جمہوری فیصلہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی پاکستان نے ایس این اے کے اس اجلاس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اگلے اجلاس میں کچھ اور نکات بھی جوڑ کرے طور پر لے گئے لیکن وہ مکمل طور پر ایس این اے کے نکات نہ بنے۔ ۱۷ ستمبر کے اجلاس میں ایک مثبت چیز رفت ہوئی کہ دیگر سانی تنظیموں کو جو پروگرام کی حمایت کرتی ہیں اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی اور ان میں سے کچھ کے نمائندے شریک ہوئے۔

انتخابات کے اعلان کے بعد ایس این اے کی رہبر کٹی میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایس این اے کوئی انتخابی ادارہ نہیں ہے بلکہ رلے عام ہمارا کرنے اور اپنے مقاصد کا شعور اجاگر کرنے کا ادارہ ہے۔ یہ دور رس فیصلہ تھا جس نے قومی تحریک کو جمہوری تحریک کے مقابلے پر کھڑا ہونے سے باز رکھا۔ اسی اجلاس میں جام سانی کو دو ماہ کے لیے کونینر بنا دیا گیا۔

تنگ نظر قوم پرستی جس کا راستہ اتحاد میں شامل ترقی پسند قوتوں نے روک رکھا تھا اپنی بھرپور کوشش کرتی رہی کہ جمہوری عمل کو سوتا نکال دیا جائے۔ تنگ نظر قوم پرستوں کے نمائندوں نے نہ صرف قوم پرستی کو جمہوری عمل سے ملوانے کی سازشیں کیں بلکہ رہبر کٹی کے فیصلوں کے برخلاف انتخابات میں انتہائی رجحیت پرست امیدواروں کی حمایت کی اور ان کے مصلوں سے خطاب کیا۔ ان ہی میں سے کئی عناصر نے ایس این اے کو میبلز پارٹی کے خلاف استعمال کرنے کی ناکام کوشش کی۔ تنگ نظر قوم پرستی میناء ازم اور آئی جے آئی سے جڑی ہوئی ہے اور اس کے رہنماؤں نے انتخابات میں جی پی پی کی کامیابی کے بعد بھی میناء الحق کی آمرانہ پالیسیوں کا تعریف کیا۔ انہوں نے کوشش کی کہ SNA سے انتخابی پلیٹ فارم کا کام لیا جائے۔ یہ بات بھی جلی کہ تنگ نظر قوم پرست اپنا کھیل کمیونسٹوں کی آڈ میں کھیلنا چاہتے تھے۔

یہ بات بلاشبہ کہی جاسکتی ہے کہ عوام کے جمہوریت کے شعورے تنگ نظر قوم پرستی کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ حیدر آباد میں بڑے پیمانے پر فاشرنگ کا مقصد سندھی اور غیر سندھی کے نفراطقیوں کو مضبوط بنانا اور پیپلز پارٹی کو کمزور کرنا تھا۔ لیکن عوام نے جمہوریت کی علامت پیپلز پارٹی کو ووٹ دے کر ایسی تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا اور تنگ نظر قوم پرستی کو مسترد کر دیا۔

انتخابات کے بعد ایم کیو ایم، جی پی پی معاہدے کے بننے میں پیپلز پارٹی نے بہت بہتر کردار کا مظاہرہ کیا اور جی پی پی کے جی کے شاہانی نے معاہدہ میں بہت اچھا کردار ادا کیا۔ ایم کیو ایم کو جیون بھی برابر دیا ڈالتے رہے کہیں رشتہ جی پی پی سے بنانا چاہیے نہ کہ آئی جے آئی سے۔

لیکن اس معاہدے کے دو عمل کے طور پر تنگ نظر قوم پرست کھل کر سامنے آ گئے۔ اور یہ کہا جانے لگا کہ جی پی پی سے میناء الحق کا دور بہت اچھا تھا اور میناء کے دل میں

سندھ کے لیے بہتر جذبات موجود تھے۔ ایس این اے میں کمیونسٹ پارٹی اور دیگر ترقی پسند پارٹیوں نے اہم اور مثبت کردار ادا کیا اور سندھ میں تنگ نظر قوم پرستی کو حاوی ہونے اور جمہوری تحریک کو کمزور ہونے سے روک رکھا۔

ملک میں جمہوری عمل کے آغاز سے جو قومی مسائل کو بھی مفاد عامہ کے پیش نظر حل کرنے کی راہیں نکلی ہیں اس سے حکمران طبقات کا بنیاد پرست کردہ اور میناء مشن کو آگے بڑھانے والے کس حد تک خائف ہیں وہ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب میں بنیاد پرست پنجابی شوانرزم کو ہودے رہے ہیں۔

آج ہمارے سامنے انتخابات کے بعد کی صورتحال ہے جس سے ایک جمہوری حکومت برسر اقتدار ہے اور آزادانہ بحث و فیض کے ذریعہ وراٹھل کا کل تلاش کرنے کا رجحان آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ بات بھی موجود ہے کہ سندھ میں قومی مسئلہ اپنی پیچیدگیوں کے ساتھ موجود ہے۔ تنگ نظر قوم پرستوں کے ہاتھوں میں اس مسئلہ کو آکر کار کرنے سے روکنے اور مثبت اور سب کے لیے قابل قبول حل تلاش کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ جمہوریت اور افہام و تفہام کی فضا میں عملی اقدامات کئے جائیں۔ اس مسئلے کے حل ہونے کے امکانات واضح ہیں۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کی فضا میں شامل دوسری جماعتیں ۱۹۷۲ء کے آئین کی حد تک قومی خود مختاری سے کوہلو ہیں اس Commitment پر عمل اس حل کی ابتدا ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ سندھ میں موجود تمام گروہ جن کے مستقل مفادات سندھ کی سرزمین سے وابستہ ہیں۔ سندھی بولنے والے ایک ایسی تحریک پر متفق ہو جائیں جس میں سندھی قوم میں ایسے تمام گروہوں کو شامل کیا جائے اور جس کی روشنی میں ایسے اقدامات کئے جائیں جو ان گروہوں کو سندھی قوم میں ضم ہونے میں مدد دے سکیں۔ یہ وہ ابتدائی مشرور ہے جو قومی حقوق کی جدوجہد کو تنگ نظر قوم پرستی سے نکل کر جمہوری جدوجہد کا حصہ بنانے کے لیے ضروری ہے۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ قومی حقوق

کو جمہوری حقوق کی جدوجہد کا حصہ بنانے کیلئے قومی حقوق کی حدوں کو آج کے حالات کے مطابق نئے سرے سے متعین کیا جائے تاکہ اس کی سمت ایک ایسے سماج کی تشکیل کی طرف ہو جس میں استعمال اور سرمایہ دارانہ ناہمواریوں کا خاتمہ ہو قومی حقوق کو حقیقت پسندانہ طور پر حاصل کرنے کی یہ جدوجہد سندھ میں ہونے کے باوجود ملک کی جمہوری جدوجہد کا حصہ ہوگی۔

قومی حقوق کا تعین کرتے وقت یہ بات پیش نظر رکھنا چاہیے کہ سندھ کے مزدور کسان، طالب علم اور مظلوم طبقات کے کسی حق سے متصادم یا نفی کرنے والا کوئی بھی حق، قومی حقوق میں شامل نہیں ہو سکتا

قومی حقوق کا معیار ہیں محنت کشوں کے حقوق کو بنانا زیادہ بہتر اور درست ہوگا۔ کیونکہ اس سے پورے ملک کے محنت کشوں کی جمہوری حقوق کی جدوجہد کی طاقت، قومی حقوق کی لڑائی کو مضبوط اور کامیاب بنائیں گی۔ اور ایک قوم کے محنت کشوں کو دوسری قوم کے محنت کشوں کے خلاف صف آرا نہ ہونے سے روکے گی اور سیاست سے بنیاد پرستی، تنگ نظری رجحیت پرستی، منافقت اور مصلحتوں کو نکال باہر کرے گی۔ یہ ضروری ہے کہ پورے ملک کے محنت کشوں کے مختلف دھاواں کو یکجا کیا جائے۔ اور یہ کام منتخب حکومت کے آنے سے آسان ہو گیا ہے۔

یہ صورت حال کمیونسٹ پارٹی اور بائیں بازو کے دوسرے عناصر کے لیے ایک آزمائش کا درجہ رکھتی ہے۔ اب دیکھنا ہوگا کہ یہ عناصر کتنی کامیابی سے تنگ نظر قوم پرستی کو رد کرتے ہوئے سندھ کے حقوق کی محنت مند جدوجہد کو جمہوری طور پر ملک کی جمہوری جدوجہد کا جز بنا کر اس مسئلہ کو جس کو عوام دشمن عوام میں پھوٹ ڈالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں کس حد تک بائیں بازو کے عناصر انہیں مسائل کو پاکستان کے عوام میں اتحاد کا ذریعہ بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

- ”سروششن خیال“ کے بارے میں ہم آپ کے خیالات جاننا چاہتے ہیں تاکہ ہم آئندہ شماروں کو زیادہ با مقصد اور آپ کے لیے کارآمد بنا سکیں۔
- برائے مہربانی اس فارم کو پر کر کے مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجیے۔
- ”سروششن خیال“
- پوسٹ بکس ۱۱۱۲۶، گلشن اقبال، کراچی ۷۷
- ۱۔ اس شمارے کو پڑھنا آسان اور مواد کے اعتبار سے چاہئیں۔
 - ۲۔ کیا مواد (الف) خراب ہے۔ (ب) واجبی ہے (ج) اچھا ہے (د) بہترین ہے (ہ) بہت اچھا ہے (برائے مہربانی ایک کے گرد دائرہ بنائیں)
 - ۳۔ کیا ڈیزائن (الف) خراب ہے۔ (ب) واجبی ہے (ج) اچھا ہے (د) بہترین ہے (ہ) بہت اچھا ہے (برائے مہربانی ایک کے گرد دائرہ بنائیں)
 - ۴۔ معلومات کے اعتبار سے اس شمارے کو آپ نے کیا پایا؟ (الف) بیکار (ب) کارآمد (ج) بہت کارآمد
 - ۵۔ آئندہ شماروں میں آپ کس طرح کے مضامین دیکھنا چاہتے ہیں/چاہتی ہیں۔ مختصر اوقات کیجیے۔

- ۶۔ کیا آپ کم از کم قیمت پر آئندہ شمارے باقاعدہ جاری کروانا چاہیں گے، مثلاً آئندہ دس فی شمارہ؟
- ۷۔ آپ کا نام اور پتہ

ہم آپ کے تعاون کے ممنون ہیں۔

اقبال اعوان

سے انسٹرویو نمائندہ روشن خیال

درکناس میں تقسیم سے قبل ریلوے وکرز یونین، اوپن لائن میں دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ یہ تقسیم تقریباً بیانیہ دوں پر نہیں بلکہ سیاسی طریقے کی وجہ سے ہوئی۔ ہم نے اس تقسیم کو روکنے کے لیے کوششیں کی مگر ناکام رہے، تاہم ابراہیم گروپ میں ہم کام کرتے رہے اور مصالحت کے لیے کوشش جاری رکھیں مگر بیرونی دباؤ کی وجہ سے ہماری کوشش کامیاب نہ ہوئیں۔ چنانچہ دونوں جانب سے قوی صنعتی تعلقات کیشن میں کیے گئے گئے آپ فیصلہ کریں کہ وکرز یونین کا اختیار کس گروپ کے پاس ہوگا۔ ہمارے نزدیک یہ اختیار ریلوے وکرز یونین کے کارکنوں اور مزدوروں کے پاس ہونا چاہیے۔ مگر قاضی نے ہماری رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اور بدستور عدالتوں سے رجوع کرتے رہے۔ اس کام سے بڑا نقصان مزدوروں کو ہوا۔ کیونکہ یہ یونین ریلوے وکرز یونین کے مزدوروں کے لیے سوداگاری بھجٹ ہے، مگر وہ اس میں مقسم ہونے کی وجہ سے کوئی دیر انداز ٹولش، مذاکرات، معاہدہ وغیرہ نہیں ہو سکتے اور یوں گذشتہ ۱۰ سال سے مزدور کا اجتماعی سوداگاری کا حق معطل (Suspended) ہے۔

اس دوران قومی صنعتی تعلقات کیشن نے دسمبر ۱۹۸۶ء فیصلہ دیا کہ۔۔۔۔۔ یونین کے عہدیداران کے از سر نو الیکشن کرائے جائیں مگر دونوں گروپ مختلف جہلوں بہانوں سے اس کو ٹال رہے ہیں۔ شاید دونوں گروپوں کے قائدین کو یہ حسیہ ہے کہ کارکن انہیں قیادت کا حق نہیں دیں گے۔ جون ۱۹۸۷ء سے مارچ ۱۹۸۸ء تک ہم نے دمرنا براہیم گروپ کے قائدین کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ مرکزی کمیٹی میں اقلیت ہونے کی وجہ سے ہم غیر موثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمیں اس جھگڑے سے اب باہر نکل جانا چاہیے تاکہ کم از کم ایک گروپ تو مکمل یونین کے طور پر اجتماعی سوداگاری کے حق کو استعمال کر سکے اس بات پر تمام لوگ متفق تھے کہ ایک علیحدہ یونین تشکیل دی جائے مگر یونین بنانے کے طریقہ کار پر اختلاف رہا، ہمارا موقف یہ تھا کہ اسے وکرز یونین مزدوروں کا جمہوری ادارہ ہوتا ہے لہذا اس کے عہدیدار اور ارکان مکمل طور پر عوامی انتخاب (الیکشن) ہونا چاہیے جیسا کہ آئین میں بھی تحریر ہے۔ کیونکہ منتخب عہدیدار زیادہ ہمت اور طاقت سے مزدور مسائل کے لیے لڑیں گے مگر مرزا صاحب کا موقف اس کے برعکس رہا تھا کہ عہدیدار اور مجلس عاملہ کی الیکشن کی جائے اور سلیکشن کا اختیار مرزا صاحب کے پاس ہوگا چنانچہ ریلوے محنت کش یونین کی تشکیل میں متوجہ بال عوامی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

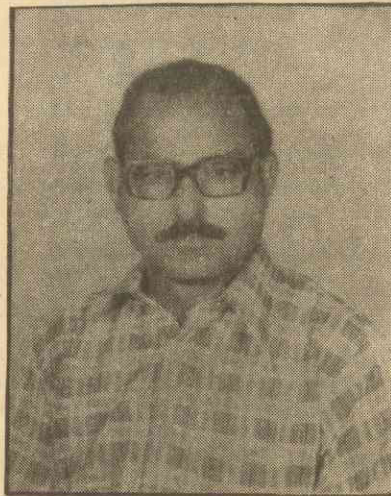
س۔ آپ ریلوے میں ٹریڈ یونین کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟
ج۔ ریلوے میں ٹریڈ یونین مومنٹ آہستہ آہستہ اپنی افادیت کھو رہی ہے۔ یہاں ٹریڈ یونین کا آڈو کردار ختم ہو رہا ہے۔ دائیں بازو کی موقع پرست ٹریڈ یونین موجود ہے۔ جو کہ مزدوروں کی طلب معیار اور توقعات پر پورا نہیں اترتی یہ مکمل طور پر سیاسی مفادات کے تابع ہو رہی ہے جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ٹریڈ یونین کو ٹریڈ یونین کے طریقہ سے کیا جائے۔

س۔ آپ نے ٹریڈ یونین کو ایک میں کب اور کن حالات میں حصہ لینا شروع کیا؟

ج۔ میں فروری ۱۹۷۸ء میں ریلوے وکرز یونین میں شامل ہوا، میرے والد بھی ریلوے ملازم تھے اور ۱۹۵۷ء میں ۳۱ سالہ ملازمت کے بعد ریٹائر ہوئے تھے۔ ریلوے ملازمین کی حالت بہت خراب تھی، بہت تنگدستی تھی۔ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ ملک میں ایوب خاں (دو) کی آمرانہ حکومت زوروں پر تھی، انہی دنوں ۱۰ سالہ دوستی منایا گیا دوسری طرف ملک میں اشتراکیت کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے خلاف ریلوے ملازمین نے ہڑتال کر دی اور مغربی پاکستان کی ریل بند کر دی۔ یہ ہڑتال کی گیارہ روز تک چلتی رہی، اس دوران ریلوے وکرز یونین میں تالابندی بھی ہوئی۔ فوجی افسران کے ذریعہ ریل چلانے کی کوششیں بھی ہوئیں مگر یہ سب ناکام رہیں، میں ان دنوں کسی بھی ٹریڈ یونین کا ممبر نہیں تھا۔ تاہم مزدوروں پر فائرنگ، تشدد اور مزدوروں کی قتل، یہ خبریں دوسرے دوستوں میں آ رہی تھیں۔ اسی ہڑتال کے بارے میں گورنری میں نے اعلان کیا تھا کہ ہڑتال کو ختم دیا جائے گا۔ سخت پریشانی تھی کہ ملک کی بے خلافت، تنخواہ میں اضافہ کے طلب کار ہڑتال کیسے بن گئے، مگر ان کا مقصد کیسے کیا جائے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی، خوف و ہراس ان کا تھا کہ کوئی تالابندی نہیں تھا، انہی یاد تیریں، ذلتوں کے ستارے ہوئے لوگوں نے ایک تحریک شروع کی جو بالآخر عوامی تحریک بنی اور اس نے آمرانہ حکومت چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس عوامی تحریک میں شمولیت آؤں گا تو بہت مقبول ہوا، اس نعرے کی مقبولیت کی وجہ سے مجھے پتہ چلا کہ اگر یہ تحریک شروع کیا جائے۔ اسی جوش کی وجہ سے جلسے اور مظاہرے جو کہ ان دنوں میں عام تھے میں شرکت کرنی شروع کی تو پتہ چلا کہ یہ مزدوروں کا نظریہ ہے، ان دنوں ریلوے وکرز یونین کے کارکن اس نعرے پر بہت بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ انہی بحث و مباحثہ نے مجھے ٹریڈ یونین کے قریب کیا اور ٹریڈ یونین کے کام کو سمجھنے کا موقع دیا چنانچہ ۱۹۷۸ء میں، میں نے وکرز یونین کی ممبر شپ حاصل کی۔ ان دنوں یہ یونین رجسٹرڈ بھی نہیں تھی، تاہم ریلوے مزدوروں میں اس کا ایک مقام تھا۔

س۔ آپ پہلے ریلوے وکرز یونین میں کام کرتے رہے ہیں تو ریلوے محنت کش یونین بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

ج۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ میں ۱۹۷۹ء میں ریلوے وکرز یونین کا جنرل سیکریٹری منتخب ہوا، تو ہمارا کارکنوں کا ایک گروپ تھا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ٹریڈ یونین ایک اتحاد اور بااختیار ادارہ ہونا چاہیے۔ اور اس کے فیصلے کام کے بارے میں مزدور خود کرتے ہیں، مگر یہیں تجربہ مختلف ہوا، ہمیں مجبور ہوا کہ لیڈر شپ مزدور اجلاسوں میں کئے گئے



میں بٹ کئی یہ کشمکش بہت دنوں سے ہو رہی تھی

24

حقیقی ترقی اور سامراجی اثر و نفوذ

مشعل

ترقی پسند سامراج دشمنی کو جب لوٹنی کی کسوٹی سمجھتے ہیں

کی اصطلاح پاکستان کے عوام کے سامراج کے لیے نئی نہیں ہے اس ملک کے محب وطن دانشور اور سیاست دان نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں امریکی ریشہ دوانیوں کی مسلسل نشانہ بنی کرتے رہے ہیں، بعض حلقوں کا خیال ہے کہ یہ لوگ روس توڑ رہے ہیں اور چونکہ روس امریکہ کا مخالف ہے اس لیے یہ بھی امریکہ کی مخالف کرتے ہیں۔ بعض سادہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ امریکہ ایک ترقی یافتہ اور طاقت ور ملک ہے اور ہم غیر ترقی یافتہ اور کمتر ور ہیں اس لیے اگر امریکہ کو ناپسند کرنا ضروری ہے تو اسے نظر انداز کر دینا چاہیے اور اس سے دشمنی مول نہیں لینی چاہیے۔

ہم ترقی پسند سیاسی حیثیت سے اس سامراج دشمنی کو جب لوٹنی کی کسوٹی اس لیے بناتے ہیں کہ یہ ملک کی حقیقی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہاں حقیقی ترقی کا مفاد ایسے متعامل کیا گیا کہ اس لفظ کو محض قومی آمدنی میں اضافہ کی شرح سے غلط فہمی پیدا کی جائے پاکستان میں آمدنی بڑھ رہی ہو تو اس ضمنی آمدنی کا اثر کسی لفظ کی جانب ہوتا ہے قومی آمدنی کے علاوہ شمار اس طرف اشارہ کرنے سے قاصر نہیں۔ اگر سات آٹھ فی صد سالانہ اضافہ کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو اقراط زر کی شرح جو کہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دس سے بارہ فیصد اور غیر سرکاری اندازوں کے مطابق ۲۰ فیصد کے گنگ جھگ ہے اس ترقی کی نفی کر دیتی ہے۔ قومی آمدنی کی شرح یا فی کس آمدنی جو کہ کل آمدنی کو آبادی کی تعداد سے تقسیم کر کے حاصل کی جاتی ہے عام آدمی کی حالت زار پر روشنی ڈالتے ہے تاہم اس لیے آج دنیا بھر میں ترقی و خوشحالی کا پیمانہ پی کیو ایل آئی

(PHYSICAL QUALITY OF LIFE INDEX) کو مانا جاتا ہے جو تین اجزاء پر مشتمل ہے یعنی زندگی کی شرح، بچوں کی شرح اموات اور اوسط عمر کا مرکب ہے۔ پاکستان میں فی کس آمدنی دیگر ترقی پذیر ممالک سے زیادہ ہے لیکن PQLI میں ہم بہت سے ملکوں سے پیچھے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں حقیقی ترقی نہیں ہو رہی۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حقیقی ترقی صرف اس صورت میں ممکن ہے جب ملک کے ذرائع پیداوار کے وسائل اور صنعت کو پینپنے کے بھرپور مواقع فراہم کرنے کے لوازمات پیدا کیے جائیں۔ ایسا اس وقت ہی ممکن ہوگا جب ملک کے معاشی ڈھانچہ میں موثر تبدیلیوں کے ذریعہ بنیادی نوعیت کی صنعتوں کو فروغ ملے جس کے لیے ضروری ہے کہ ملکی وسائل کو محتاط طریقہ سے بہتر ترین انداز سے استعمال کیا جائے ملک کی معاشی منڈی میں اپنے مفادات کا تحفظ کیا جائے اور ضروری کسان کے خون پسینے سے حاصل

ہونے والے سرمائے کو خرچ کرتے وقت خاص قومی مفاد میں بین الاقوامی معاہدے اور سودے کیے جائیں۔ جن اشیاء یا ٹیکنالوجی کی ملک کو ضرورت ہو وہ ان ہی ذرائع یا ممالک سے حاصل کی جائیں جہاں سے یہ کم قیمت میں خریدی جاسکتی ہوں اور تیار مال تو وہیں فروخت کیا جائے جہاں ان اشیاء کے زیادہ سے زیادہ دام ملنے کی امید ہو مال کی منافع بخش فروخت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دنیا بھر کی منڈی میں ہماری پہنچ ہو۔ حقائق اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ ہم بیرونی دباؤ کے باعث اپنا مال سمستا اور محدود مقدار میں بیچتے ہیں اور ہنگامہ مال و نقد کرتے ہیں مزید یہ کہ داخلی سطح پر بھی ہم ایسے اقدامات پر عملدرآمد نہیں کرتے جن سے عوام کے معیار زندگی میں اضافہ ہو سکے۔ آخر ایسا کیوں کر ہے؟

اس صورت حال کا سبب ملک پر سامراجی ممالک کا اثر و نفوذ ہے جو مختلف مالیاتی اداروں خاص طور پر عالمی بینک اور آئی ایم ایف (IMF) کے ذریعہ کیفر فرائض پر قرض فراہم کرتے ہیں تاکہ اپنے حواریوں، دلال سرمایہ دار، قومی بیوروکریسی اچھا دار سرمایہ دار، جاگیرداروں اور سبیل بیوروکریسی معاشی ٹوٹ گھوٹ میں حصہ دار بنا کر اس ملک میں قائم فرسودہ نظام کو غیر فطری طور پر دوام بخشنا جاسکے۔

- کی شرح سے کم ہو۔
- مختلف منسلکوں کے بیوروکریسی میں ہم آہنگی پیدا کرنا۔
- کھاد اور گندم کے لیے دی گئی رعایت میں کمی کرنا۔
- قومی اداروں میں بہتر نظام اور ان کی نشاۃِ زیادہ خود مختیار اور حیثیت کی بحالی۔
- غیر منافع بخش قومی اداروں کی از سر نو تشکیل۔
- بنیادی معاشی ڈھانچہ کو اس طرح اچھلت دینا کہ ترقیاتی بجٹ اور قومی پیداوار کا تناسب برقرار رہے۔
- انتظامی امور میں بہتری پیدا کرنا۔
- کلیدی صنعتوں میں توجہی بنیادوں پر سرمایہ کاری کرنا۔
- نجی سرمایہ کاری کو فروغ دینا۔
- سرمایہ کاری کی بہتر شرح کو مستحکم کرنا۔
- صوبہ اور مرکز میں دولت کی تقسیم کے لیے نئے فارمولے کو لاگو کرنا۔
- سیلون ٹیکس بڑھانا۔
- ٹیکسوں کی وصولیاتی کے نظام میں بہتری پیدا کرنا۔
- عوامی سہولتوں کی قیمت کی وصولیاتی کو ممکن بنانا۔
- حکومت کے قرضے لینے کی شرح میں کمی کرنا۔
- پانچ سو ملین روپے مالیت تنگ کے کارخانوں کے قیام کے لیے اجازت نامے حاصل کرنے اور دیگر متعلقہ لوازمات کو ختم کرنا۔
- قومی سلامتی، مذہب اور صحت عامہ سے متعلق پروگرام کو ترجیح دینا۔
- بالواسطہ اور بلاواسطہ پرائس کنٹرول میں کمی کرنا۔
- اہم فصلوں میں پورے پھل کو جاری رکھنا اور ہر قسمی عمل دخل کو کمزیر محدود کرنا۔
- بنیادی سہولیات کے استعمال پر ٹیکس لگانا۔
- بینکوں کو زیادہ محتاط ہو کر قرضہ فراہم کرنے کی ہدایت کرنا۔
- موثر قانونی قابضوں اور نظام کے ذریعہ قرضہ جات کی وصولیاتی کو یقینی بنانا۔

قرضوں کے عوض آزادی سامراج کے پاس گروی رکھ دی جاتی ہے۔

- بینکوں کے موجودہ نظام میں فوری نوعیت کے تہذیبوں کے ذریعہ بہتری پیدا کرنا۔
- مشین کی درآمدی قیمت پر عائد عہد کو فی الفور ختم کرنا۔
- درآمدی پابندیاں ختم کرنا۔
- کم از کم ڈیوٹی ۱۰ فیصد لگا کر درآمدی سرچارج ختم کرنا۔
- حقیقی ترقی اور خوشحالی کی جانب سفر کا آغاز ملک کو سامراجی شکنجے سے آزاد بخیر ممکن نہیں اس لیے دھرتی کا سینہ چیر کر گندم کی بالی اکٹھے والے اور اپنے خون پسینے سے کارخانوں کو چلاتے والے ہزاروں انسانوں سے وفادار قوتوں کا فرض ہے کہ وہ عوام کے سامنے اصل دشمن کی نشاندہی کرتے ہوئے انہیں منظم و متحرک کریں اور عوام کی ہمتیہ حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتے ہوئے موجودہ حالات میں ممکنہ متبادل معاشی حل کی نشاندہی کریں۔

سامراج کے مفاد پرستی یا سستی پچھو عوام کے ساتھ قرضوں کو امداد کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور ان قرضہ جات کے ساتھ دباؤ شراٹھ کو جو واضح طور پر ملک کے داخلی معاملات میں دخل اندازی کی مترادف ہوتا ہے عوام کے نظروں سے مخفی رکھتے ہیں۔ پہلے سخت کش عوام کے ساتھ وسائل میں کمی کا رونا زور شور سے دیا جاتا ہے پھر عوام دشمن شراٹھ پر وسائل حاصل کیے جاتے ہیں اور بعد میں انہیں عوامی انگٹوں کے خلاف خرچ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک طرف عوام پر قرضوں کا بوجھ پڑتا ہے اور دوسری جانب ان کی آزادی سامراج کے پاس گروی ہو جاتی ہے۔

- ۱۸ء میں پاکستان کو عالمی بینک نے یہ دھمکی دی تھی کہ وہ قرضوں کی اقتضا کی فراہمی منقطع کر دے گا۔
- مارشل لا حکومت نے عوام کو اعتماد میں لیے بغیر عالمی بینک کی نادرہ شراٹھ قبول کر لی جن سے خیرات شراٹھ درج ذیل ہیں۔
- مزدوروں کی رفتار و فتنہ چھائی کرنا۔
- عمومی طور پر تنخواہ میں اضافہ نہ ہو کر اقراط زر میں اضافہ

دوسرا اور آخری حصہ

عابد حسن منٹو

تمائز ترقی پسند دانشور

سے ایک انٹرویو

تمائز روشن خیال

اسے ہم مضبوط کرنا چاہتے ہیں کیونکہ صنعت کاری کے بغیر کوئی بھی صلاح ترقی نہیں کر سکتا اور جمہوری اصولوں کی بنیاد پر ہم اسٹیٹ کو پیلا نا چاہتے ہیں۔ یہ تین LDF کے پروگرام کی بنیادی باتیں ہیں۔

ان باتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے ہمیں LDF میں وسیع تر ترقی پسند سوچ رکھنے والی قوتوں کو شامل کرنا چاہیے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ LDF ایسے وقت میں تاجیب ایکشن کی آمد آمد تھی اور بہت سارے ایسے عناصر جو اس میں آ سکتے ہیں ایکشن میں معروف تھے اس لیے انھیں شامل کرنا اس عمل میں اس وقت مشکل تھا۔ اس لیے جو پانچ چھ پارٹیاں یا گروپس جو اس میں شامل ہوئے ہیں ان میں تقریباً سب ہی وہ ہیں جو مارکسٹ سیاست کرنے والے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ LDF کو اگر ایک حقیقی متبادل

اور اس میں کون کون سی قوتیں سرگرم عمل ہیں۔ جواب: اصل میں یہ LDF جو بنا ہے اس کے پروگرام کا تو میں ذکر کر چکا ہوں کہ بنیادی پروگرام یہ ہے کہ جدید نوآبادیاتی نظام سے ہم نے نجات حاصل کرنی ہے۔ پھر یہ کہ جیسا میں نے پہلے کہا کہ جدید نوآبادیاتی نظام تین بنیادی قوتوں کا مجموعہ ہے۔ ایک تو سرمایہ اثرات ہیں، دوسرا جاگیردارانہ نظام ہے، تیسرا یہاں پر جو ملٹری بوروکریٹ کنٹرول ہے اور سامراج کا جب ہم ذکر کرتے ہیں تو سامراج میں ہم اس عنصر کو شامل کرتے ہیں جو سامراجی سرمایہ کی شکل میں ہمارے ملک میں موجود ہے اور جو کسی نہ کسی حوالے سے سامراج کی حمایت کرتا ہے اس کے برعکس ہم نے LDF کے اندر جو نقشہ پیش کیا ہے وہ یہ کہ زمین کاشت کرنے والوں کی ملکیت ہونی چاہیے۔ قومی صنعت جرجی ملکیت کے اندر ہے

سوال: اسی حوالے سے منٹو صاحب ایک بات یہ بھی ہے کہ بائیں بازو کی اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے کیا مستقبل قریب میں بائیں بازو پیپلز پارٹی کے متبادل کی جھلک دکھانے کی پوزیشن میں ہوگا۔

جواب: یہ میں نہیں کہتا کہ وہ ہوگا یا نہیں ہوگا لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہو سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس

ایکشن سے اور پچھلے پالیسی سال کی سیاست سے لیفٹ کے ان حصوں نے کوئی سبق سیکھا ہو۔ کوئی دوسرا بھی نظر نہیں آئی کہ لیفٹ کے مختلف عناصر جو مختلف سیاسی جماعتوں کے اندر یا مختلف سیاسی جماعتوں کی صورت میں موجود ہیں۔ اگر ایک صاف ذہن کے ساتھ بات ان کے سامنے آئے کہ یہ جو انہوں نے فصول اکیڈمک بحثوں میں وقت ضائع کیا اور ملٹی بحثوں کی بنیاد پر اپنی تقسیم در تقسیم کی، اس کو اگر وہ چھوڑ کر ایک متحد پلیٹ فارم پر جو اپنی ڈی ایف کے اعلان نامے نے ہمیں کیا ہے جمع ہوں۔ اس کا بنیادی موضوع ہی یہ ہے کہ یہ جو جدید نوآبادیاتی اسٹیٹ سے اور جو اس کے تین بنیادی ستون ہیں اس سے نجات حاصل کریں اس کے اوپر اگر یہ قوتیں اکٹھی ہوں اور فعال ہوں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ پیپلز پارٹی کا متبادل نہ بن سکیں۔ دوسری جو بات میں خاص طور سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ جو اگلے چار پانچ سال آئے والے ہیں ہمیں نہیں معلوم کہ کس طرح کی مالی اور ملکی تبدیلیاں رونما ہوں گی کیونکہ عیشت کا حال بہت خراب ہے۔ کس حد تک جو ہماری موجودہ حکومت ہے وہ پاکستان کو اس بحران سے نکال سکتی ہے اور کس حد تک وہ اور زیادہ آئی ایم ایف عالمی مالیاتی ادارہ ورلڈ بینک اور دوسری جو عالمی ایجنسیز ہیں ان کے ماتحت ہوگی یہ بات تو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اب دو کام ہیں ہمارے سامنے ایک تو یہ لیفٹ اور ڈیموکریٹک قوتوں کو اور منظم کیا جائے جدید نوآبادیاتی نظام سے نجات حاصل کرنے کی بنیاد پر اور یہ ایک ایسے طریقہ سے کیا جائے کہ اس میں جو موجودہ صورت حال ہے اس میں قوتوں کا توازن ایسے نہ بگڑ جائے کہ مارشل لا لگنے کے امکانات بڑھ جائیں۔ یہ کافی مشکل صورت حال ہے کہ مارشل لا، سے اجتناب بھی کرنا، لیکن اپنے طاقت میں اضافہ کرنا اور اپنی تنظیم کاری تیز کرنا۔

سوال: اب منٹو صاحب ہم حالیہ بننے والے لیفٹ ایڈڈیکریٹک فرنٹ کی طرف آتے ہیں جس کا آپ کو سپلائرینز پر مقرر کیا گیا ہے یہ بتائیں کہ اس کے بنیادی اعراض و مقاصد کیا ہیں۔



کے طور پر بنانا ہے تو اسے صرف مارکسٹوں کا گروپ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اسے ایک وسیع لیفٹ ڈیموکریٹک جوائس کا نام ہے اور اس کے مطابق اس میں لیفٹ بھی ہونا چاہیئے جس میں مارکسٹ اور مارکسٹوں کے باہر کے لیفٹ کی قوتیں بھی ہیں اور وہ ڈیموکریٹک قوتیں بھی ہونی چاہئیں جو چارلس لیفٹ کو مابین یازد مائیں لیکن جوائسے ملک کو سامراج سے آزاد دی ولانا چاہتی ہیں اور لیفٹ لوگ بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ پیپلز پارٹی میں موجود ہیں۔ ANP میں PNP میں موجود ہیں جو کہ تحریک استقلال کے بھی بہت سارے لوگ آپ کو ایسے نظر آئیں گے جنہوں نے ریاست کی ہے اور ہم نہیں سمجھتے اگر واقعی کوئی صحیح معنوں میں کوشش کی جائے تو ہم ان تمام قوتوں کو نہ جوڑ پائیں یقیناً ہم ان تمام قوتوں کو ساتھ جوڑ سکتے ہیں۔

سوال: منٹو صاحب تو کیا ہیں وہ بھی اس کا نام لیفٹ اینڈ ڈیموکریٹک فرنٹ رکھا گیا اور لیفٹ ڈیموکریٹک فرنٹ نہیں؟ یا آپ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے؟ جواب: اصل میں یہ کہیں پر تو لیفٹ اینڈ ڈیموکریٹک لکھا گیا ہے اور کہیں پر لیفٹ ڈیموکریٹک لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جو ڈیموکریٹک ہے وہ لیفٹ اینڈ ڈیموکریٹک ہے۔ مطلب یہ کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو لیفٹسٹ کہتے ہیں وہ بھی شامل ہیں اور جو لیفٹ کی سیاست سے مجبوری طور پر متفق نہ ہوتے ہوئے بھی پاکستان کے حوالے سے ڈیموکریٹک سیاست کرتے ہیں۔ وہ بھی شامل ہیں اور ہونا چاہیئے کیونکہ میرے خیال میں پاکستان میں ڈیموکریٹک سیاست کرنے کا مطلب صرف ۱۹۷۳ء کے آئین کو بحال کروانا اور ایکشن کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان قوتوں سے نجات حاصل کرنا ہے جو ۱۹۷۳ء کے آئین کو صوبہ ناکرہ کرتے ہیں جو جمہوری عمل کی راہ میں رکاوٹ ہیں جو سامراج بھی ہے، جاگیر داری بھی ہے اور تو کرنا چاہیئے بھی ہے۔

سوال: ایک بات اور منٹو صاحب کہ اس فرنٹ کے قیام کے سلسلے میں ہونی والی بات چیت کے دوران یالیوں کیسے کہ شروع سے لے کر اس کے ختم تک ایک اور جماعت اس میں شامل تھی جو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان (مانیوررنگ) کے نام سے جانی جاتی ہے۔ لیکن مین اس کے قیام کے وقت انہوں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی، اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب: پہلی بات تو یہ کہ انھوں نے علیحدگی نہیں اختیار کی کیونکہ جو پہلی جماعتی پریس کانفرنس تھی جس میں ہم نے باقاعدہ اس کا اعلان نامہ پیش کیا اور وہ اس میں اعلان کیا کہ ہم نے یہ فرنٹ قائم کیا ہے، اس میں بھی وہ لوگ موجود تھے۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی مانیوررنگ جو سے اس نے بھی ایک اپنے آپ کو باضابطہ طور پر ایک تنظیمی شکل نہیں دی ہے۔ وہ اگرچہ دوسری کمیونسٹ پارٹی کی ایک گروپ کے طور پر کام کرتے ہیں مگر ان کے تقریباً تمام لوگ ANP کے اندر کام کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے لیے اس وقت اس حالت میں مسئلہ یہ تھا کہ تنظیمی لحاظ سے وہ ANP سے کیٹیڈ ہیں اور کمیونسٹ پارٹی کے ایک گروپ کی حیثیت سے اس وقت تک شایدا ان کا فیصلہ ہی تھا کہ وہ ANP کے اندر ہی رہیں گے۔ پھر ان کے کچھ لوگ ANP کے حوالے سے ایکشن بھی لڑ رہے تھے اس لیے ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے گروپ کی حیثیت سے

اس پر دستخط کر سکیں کیونکہ باضابطہ طور پر وہ ابھی بھی اپنے آپ کو ANP کہتے ہیں۔ انہوں نے ویسے ہم سے کہا کہ ہم آپ کے اس اعلان نامہ سے متفق ہیں لیکن باضابطہ طور پر ابھی اس پر دستخط نہیں کر سکتے۔

سوال: کیا قومیتوں کے مسئلے پر LDF میں اتفاق رائے ہے یا اس پر اختلاف پایا جاتا ہے؟

جواب: LDF کا جو اعلان نامہ ہے اس میں قومیتوں کے مسئلے پر باقاعدہ ایک پیرا لگایا ہے۔ اس پیرا گراف پر ہم سب لوگ متفق ہیں اسکا جوہر یہ ہے کہ ہم پاکستان کو ایک کیٹریل قومی ریاست سمجھتے ہیں۔ ہم تمام قومیتوں کو برابر کے حقوق دینا چاہتے ہیں۔ ہم ایسے فیڈریشن کے قیام کو درست سمجھتے ہیں جس میں ہر مذاکرہ کارانہ طور پر لوگ شامل ہوں۔ سوال: اب منٹو صاحب کچھ روشنی افغانیستان کی حالیہ صورت حال پر ڈالیں خصوصاً اب جو سوویت یونین اور ان نام نہاد مجاہدین کے درمیان براہ راست مذاکرات ہو رہے ہیں اس کے کیا نتائج نکلتے کے امکانات ہیں؟ اور اس کے پاکستان کی سیاست پر کیا اثرات پڑیں گے۔

جواب: پہلی پہلی بات یہ ہے کہ اب جو پاکستان میں نئی سیاسی صورت حال پیدا ہوئی ہے یہ مگر اس حکومت کا بھی ابھی تک یہی وقت ہے کہ ہم کچھ افغانی پالیسی ہی کو جاری رکھیں گے۔ اس کا تو یہی مطلب ہے کہ وہاں جو ایک لڑائی جاری ہے اور ہم جو امریکیوں کے

کی براہ راست مداخلت نہیں رہے گی۔ اگرچہ سات جوائی اتحاد امریکہ کے مفاد کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی براہ راست بات چیت کا فائدہ یہ ضرور ہوگا کہ بات کافی وسیع پیمانے پر ہو جائے گی اور میں سمجھتا ہوں کہ افغان حکومت نے اس وقت جو نیشنل ریکنسی لیشن کی پالیسی اپنائی ہوئی ہے اس سے افغانیستان میں ایک وسیع تر بنیادوں پر حکومت کے قیام میں مدد ملے گی۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا امریکی مفاد بھی اس وقت افغان مسئلہ کے سیاسی حل میں ہیں؟

جواب: نظر تو یہ آتا ہے کہ اس وقت امریکا میں اس مسئلہ پر دور رائے پائی جاتی ہیں اور کچھ زمانے میں صورت حال یہ بھی تھی۔ امریکہ کا جو سیاسی حصہ ہے وہ اس کو سیاسی بنیادوں پر حل کرنا چاہتا ہے۔ جب کہ ان کا جو دوسرا حصہ پیشانگوں کی صورت میں موجود ہے وہ ایسا نہیں چاہتا جیسا کہ خود پاکستان میں صورت حال تھی کہ جو یہ حکومت اس کو حل کرنا چاہتی تھی جب کہ حیناء اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر صورت حال جیسے تیزی سے بہتری کی جانب جارہی ہے تو شاید یہ مسئلہ جلد ہی حل ہو جائے گا۔ پھر یہ کہ جو عالمی سطح پر صورتحال میں تبدیل آئی ہے خصوصاً ریگن، گورباچوف بات چیت سے اور عالمی طور پر جو ایک بہت ہی بڑھتا ہوا دباؤ پیدا کر رہا ہے سوویت یونین کے اس کے لیے وہ بھی ایک بنیادی عنصر کے طور پر کام کرے گا اس

ہیں "LDF" میں وسیع تر ترقی پسند سوچ رکھنے والی قوتوں کو شامل کرنا چاہیے

صورت حال میں۔

یہاں یہ بات بھی کہنا ضروری ہے کہ افغانیستان کے بارے میں ہمارے ہاں ایک کنفیوژن پھیل چکا گیا ہے کہ سوویت یونین نے جو فوجوں کو واپس لے جانے کا فیصلہ کیا ہے وہ بھجن، اس لیے کہ افغان مجاہدین نے انہیں مار مار کر باہر نکال دیا ہے۔ اس میں شاید ایک ذرہ بھی سچ کا ہو سکتا ہے۔ جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ سوویت یونین کی خارجہ پالیسی میں جو ایک بنیادی تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ یہ کہ جتنے بھی متنازع مسئلے ہیں ان کو بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ حقیقت اسی چیز کی کوشش ہے جو انہوں نے اپنے اعلان نامہ میں کہی ہے کہ ہم دنیا سے... ہم ایک ایسی ہتھیاروں کا خاتمہ کر دیں گے اس سے بالکل جڑا ہوا ہے۔ یہ افغان مسئلہ پھر پورپ اور خود امریکہ کا ایک بہت بڑا حقہ سوویت یونین کی ان پالیسیوں کی حمایت کرتا ہے اس لیے یہ اس مسئلہ کو حل کرنے میں کافی مددگار ثابت ہو گا۔ یہ خود ایک دباؤ ہے امریکہ پر کہ افغان مسئلہ کو حل کیا جائے تاکہ اس سے بچے ہوئے دیگر غیر متعلقہ ایسی اسلحہ کے خاتمہ کے مسئلہ پر عمل درآمد ہو سکے۔

اسلو کو سپلائی کرتے کا کام کر رہے ہیں اس کو جاری رکھیں گے۔ تو اب تک تو یہی موقف ہے اس حکومت کا اور انہوں نے کوئی چھاپا بھی نہیں ہے اس موقف کو۔ لیکن عالمی صورت حال خود اور پھر اس میں جو افغانیستان سوویت بات چیت ہے اور خود پاکستان کے اندر ایک جمہوری سیاست کا سامنے آنا جس کے اندر قوتوں کا توازن اب اس طریقے سے بن گیا ہے کہ I آ بھی موجود ہے پیپلز پارٹی بھی موجود ہے اور ان کو خود اپنے اندر ایک توازن قائم کرنا پڑے گا اور پھر جو دیگر جمہوری قوتیں ہیں ملک کے اندر انہیں شاید کچھ زمانے سے زیادہ آسانی سے کام کرنے کا موقع ملے گا۔ یہ دونوں چیزیں کیلیپیٹری ہیں لیکن جڑا ہوا بات ہے وہ یہ کہ ان سوویتوں افغانوں کے ساتھ جماعتی اتحاد کے درمیان جو بات شروع ہوئی ہے اس میں پاکستان شامل نہیں ہے۔

اب تک جو پورٹریٹ اس سلسلے میں آئی ہیں اس میں سوویت یونین کی طرف سے تو یہ بات ہی آئی ہے کہ اس میں پیش رفت ہوئی ہے اور ان کا یہ خیال ہے کہ یہ صرف جنگی قیدیوں تک مسلمان نہیں رہے گا بلکہ بات اس سے کہیں زیادہ آگے جائے گی۔ اور یہ بتا ہے اس افغان مسئلہ کو خود سے بغیر امریکہ اور پاکستان کی مدد کے حل کرنے کی جہتیں کھلتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں پاکستان اور امریکہ

28

کئی معتدل کا قیام تھا جس کے لئے صوبہ سرحد سے مزدوروں کی آمد کی بہت افزائی کی جا رہی تھی۔ کراچی میں اسی آبادی کی واسطے سبیل پر ڈھری تھی۔ جو غیر سندھی تھی اور جو مہاجرین نہ تھی صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشی عمل پورے پاکستان سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ کر لایا تھا۔ اس طرح کراچی رفتہ رفتہ ایک کثیر الصوبہ بنی اور پالیٹکس میں تبدیل ہو رہا تھا۔ یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے۔ جو دوسرے کئی سوالوں کو جنم دیتا ہے۔

پہلا سوال تو یہی کہ اس عمل کو روکا جاسکتا تھا۔ اس کا جواب جزوی طور پر نفی میں ہے۔ پورے برصغیر میں بلکہ دنیا بھر میں بڑے شہر جو صنعت و تجارت کا مرکز ہوں اور بڑی تجارتی بندرگاہ بھی ہوں بالکل اسی طرح دوردراز کے علاقوں کی آبادی کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اور کلکتہ کی صورت حال ہم نے غلط آبادی کے لحاظ سے کراچی سے کئی گنا پیچیدہ پائی۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں کہیں بروقی آباد کاروں کی ہجرت ہوئی ہے وہاں آبادی میں تناؤ اور احتجاج بھی پیدا ہوا ہے۔ اس طرح معاشی عمل تناؤ سے بالکل خالی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر اسباب اعلیٰ و مفاد اس عمل سے پیدا ہونے والے تناؤ کو مستقل نرمی اور ہوشمندی سے سہارا کرتے جائیں تو یہ تناؤ بہت کم ہو سکتا ہے۔ یہاں ہجرات دوردراز کی ہیں۔ مثلاً کراچی کی صنعت کاری کے ساتھ ساتھ سندھ سے مزدوروں کو کئی طریقوں سے لایا جاتا ہے۔ بہت افزائی کے لئے طرح طرح کی مراعات دی جاتیں، مزدوروں، مالکوں اور دیگر کارکنان میں سندھیوں، مہاجرین اور دیگر مہاجرینوں سے آنے والوں کا ایک اچھا تناسب پیدا کیا جاتا تو صورت حال دوسری ہو سکتی تھی۔ لیکن ایسا کیا نہیں گیا۔

صحت مند ٹریڈ یونین سرگرمیاں محنت کش طبقہ میں نسلی اور لسانی بھد کو دور کرنے میں کردار ادا کر سکتی تھیں۔ شہر کی ثقافتی اور لسانی سرگرمیاں درمیانہ اور بالائی طبقہ کو ایک دوسرے سے قریب لاسکتی تھیں۔ بمبئی میں ہم نے بھی دیکھا کہ شہر میں میسرنت نئے ثقافتی پلیٹ فارم گھرائی، میراٹھی اور پوچی کے درمیانہ اور بالائی طبقہ کو چھلانگ لاتے رہتے ہیں ان کا ایک دوسرے سے ہلکا چھلکا مقابلہ بھی چلتا رہتا ہے۔ لیکن وہ ایک دوسرے سے جھگڑتے ملتے بھی رہتے ہیں۔ لیکن ایک بہت اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اس طرح کی کثیر الزبان اور کثیر النسل اجتماع میں پورے ملک میں رائج دفاتی نظام کا راست بنیادوں پر ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ بمبئی تک میں جہاں پورے برصغیر تو کیا۔ غالباً پوری دنیا کی آبادی کے نمائندہ نسل سکتے ہیں۔ دفاتی نظام کی کارکردگی اتنی توانا ہے کہ اس رنگ و روشنی کے سیلاب میں، خاص میں مراٹھا رنگ غالب نہیں ہو گیا۔ بلکہ مضبوطی سے اپنی جگہ قائم ہے اس طرح اگر ہمارے وطن میں ابتداء سے دفاتی اصولوں پر بغیر کسی الجھن یا تھک کے عمل کیا جاتا تو ملین ممکن تھا۔ کراچی بھی ایک سندھی رنگ قائم رہتا۔ اس سندھی رنگ سے مہاجرین کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ وہ ابتداء سے ہی فزونی طور پر اپنے آپ کو اپنے نئے وطن پاکستان کے اس صوبہ کا حصہ بنانے پر آمادہ رہتے جہاں انہوں نے اپنا رہائش اختیار کر لی تھی اور جہاں وہ اپنی ساری کشتیاں جلا کر پیچھے تھے اور اگر ابتداء سے ہی یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تو مہاجرین کی مخالفت کرنے کا سوجھ بوجھ نہیں کیونکہ یہ بات ان کے مفادات کے خلاف جاتی ہوئی نظر نہ

آتی۔ سندھی تحریک کے ساتھ مسئلہ یہ نہیں کہ وہ کیوں وجود میں آئی۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت دیر سے اٹھی جب تک حالات ناقابل یقین حد تک بدل چکے تھے۔ عادی بن چکے تھے اور خود مہاجرین میں ایک خاص طرز فکر چڑھ چکا تھا۔ ایسی صورت میں سندھی حقوق کی تحریکیں انہیں اپنے وجود کے لئے خطہ کی طرح لگیں۔ جس نے انہیں رجعت پرست سیاسی جاعزوں کو گود میں دھکیل دیا۔ یہ بات مہاجرین کے طبقاتی کردار کے خلاف تھی۔ مہاجرین کی اکثریت درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے اور یہ طبقہ جمہوریت کا براہ راست پٹا ہے۔ سم دیکھتے ہیں کہ ایوب خاں کی آمریت کے خلاف اٹھنے والی جمہوری تحریکوں کے ابتدائی دور میں کراچی، حیدرآباد اور سکھر کے مہاجرین اول میں رہے۔ لیکن بعد میں یہ کردار منتقل نہ رہ سکا۔ اس طرح تاریخ کے ایک خاص موڑ پر ہمیں ایک پوری کمیونٹی کے اندیشوں اور مستقبل کے تئیں ان کی مہاراجت اور بے یقینی کا نشان ملتا ہے جو اسے ملک کی تھیں آبادی کی جمہوری انگوں کو اپناتے ہیں۔ وکالت بنتا ہے۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات کے بعد جب پاکستان پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی اور سندھ میں دوسری نوعیت کی تبدیلیاں آئیں۔ ایک طرف تو عام سندھی بہت خوش اور پر امید تھے دوسری طرف مہاجرینی صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ لسانی مسئلہ پر مہاجرین میں جو زیادہ تر بدعنوانی ہو اس کی وجہ صرف مہاجرین کے اندر معاہدے کے جذبات نہ تھے۔ بلکہ اس وقت کے سندھ کے وزیر اعلیٰ جناب ممتاز علی جھڑ صاحب اس تمام بدعنوانی کے سب سے بڑے ذمہ دار تھے ان کا رویہ ایک عجیب خاصانہ قسم کا تھا ایک نازک اور حساس مسئلہ کو عقل مندی کے ساتھ اٹھانے کی جگہ انہوں نے سستی قہر بازی کو فروغ دیا اس طرح چند جذباتی سندھی نوجوانوں نے انہیں سندھ کا کبیر ٹھکانہ بنادیا۔ لیکن مہاجرین میں شدید رد عمل پیدا ہو گیا۔ مہاجرین برکچہ یہ تاثر پڑا تھا کہ تمام سرکاری دفاتر میں تین تین بیٹھنے کے اندر اندر سارا کام صرف سندھی زبان میں ہوا کرے گا اور مہاجرین پر لازم ہے کہ ہمیں جیسے میں سندھی سیکھ لیں۔ لسانی بل میں ایسی کوئی شے نہ تھی۔ محض خاصانہ نعروں سے ماحول اور بھی خراب کر دیا تھا۔

حقیقت کیا تھی؟ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے۔ کہ حقیقت ایک بالکل نیمری ہی تھی اور ہے۔ سرکاری دفاتر میں کام نہ داروں میں ہوتا تھا اور نہ سندھی میں بلکہ انگریزی میں برتاہے اور غالباً ہوتا رہے گا۔ ان آسمان سے باتیں کوئی خالوں کے انہار کو کسی اور زبان میں منتقل کرنے میں سچاس برس لگ سکتے ہیں۔

جس قدر بے بنیاد یہ مسئلہ ہے اسی قدر حقیقت بے بنیاد ذریعہ تعلیم پر مباحثہ ہے۔ ذریعہ تعلیم سندھی ہوا اور اس کی بحث ہم اس وقت کرتے شامل کھیلے لگیں جب ہمارے پاس علوم و فنون پر ان دونوں زبانوں میں وافر تعداد میں کتابیں موجود ہوں۔ حقیقت یہی ہے کہ برائری کے بعد مسائل کی تو تمام تر اور آڑ کی بیشتر اچھی کتابیں انگریزی میں ہیں ان کتابوں کو انگریزی میں پڑھنے سے طلباء کو کوئی بہت عظیم نقصان بھی نہیں ہوتا۔ حقیقت تو

یہ ہے۔ اگر آج آپ سندھ میں ذریعہ تعلیم سندھی یا اردو بنادیں تو والدین کی جگہ اٹھیں اور طلبہ جتنے کم علم آج ہیں اس سے چو گئے کم علم درس گاہوں سے برآمد ہوں۔ ہندوستان میں رہ کر میں نے بل بل لکھ لکھا تھا۔ جب آپ ایک مگر رہ رہے ہوں تو چڑیں اپنے اپنے شاہدہ میں آجائی ہیں اب حقیقت یہ ہے کہ آزادی سے آج تک نہ صرف وہاں دھڑی کام انگریزی میں ہو رہا ہے بلکہ ذریعہ تعلیم سائنس اور آرٹس و سائنس کے لئے اصل میں انگریزی ہی ہے لیکن اس کے باوجود میں نے لوگوں میں نہ تو مذہب قومیت کو معدوم پایا اور نہ انہیں اپنے ثقافتی اور تاریخی ورثے سے محروم دیکھا۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کی جگہ مشہور ناول نگار مین تارا سہگل نے وجود بے لکشی پنڈت کی بیٹی ہیں ایک دلچسپ بات کہی۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کوئی زمانہ تھا کہ انگریز ہم پر حکومت تھا وہ حالات بدل چکے ہیں اب ہم آزاد ہیں انگریز جاتے ہوئے ہمیں انگریزی زبان بھی دے گیا اور ریل کی پٹریاں بھی اب جس طرح ہم ان پٹریوں کو اکٹھا نہیں پھینکا اسی طرح انگریزی زبان کو بھی ملک سے نہیں کیا۔ یہ بھی ایک ریل کی پٹری ہے۔ جو ساری دنیا کو سم سے ملا دیتی ہے۔ میرے خیال میں اس بات پر ہم پاکستانیوں کو بھی غور کرنا چاہیے۔ غربت وطن اور بڑی قدر اقدار ہندوستان میں انگریزی اپنانے کے باوجود انگریزوں کو موجود ہیں؟ اور ساتھ ہی سترہ اٹھارہ زبانیں بھی چل چھل رہی ہیں۔ غالباً اس کا راز تنوع کو تسلیم کرنے سے ہے اور تاریخ کی جانب غیر جذباتی رویہ اختیار کرنے میں۔۔۔۔۔ مگر ہندی بیٹی کے پاس بھی اردو کی جانب غیر جذباتی رویہ اختیار نہ کر سکے۔ کم اندیشی کے ساتھ انہوں نے ہندی کے نام سے ایک ایسی زبان بھری جو مقبول عوام نہیں ہے۔

طویل مارشل لا نے سندھ میں احساس محرومی کو کتنا شدید کر دیا۔ اس محنت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انتہا پسند تحریکوں کو مکمل کھینے کا موقع ملا جو سندھیوں کے حقیقی مسائل کو تنہا اس افسانوی رنگ بھی دے سکتی تھیں۔ ضیاء الحق صاحب آج اس دنیا میں نہیں اور خدا ان کے گناہ معاف کرے۔ پیپلز پارٹی کی حمایت کاٹنے کے چکر میں انہوں نے انتہا پسند عناصر کی دل کھول کر سرپرستی فرمائی غالباً ان کا خیال تھا کہ حالات اگر قابل سے باہر نہ ہوتے تھے تو ان عناصر کی کامیابی سے سرکونی کر دی جاتی۔ بعض سندھی لیڈروں نے سندھ کے قومی حقوق کی تحریک کو نسلی رنگ دے کر نوجوانوں کو یہاں تک سمجھایا کہ تنہا ہی کو شش کی جگہ تو سترہ لاکھ مہاجر جو سندھ میں چالیس برس سے رہ رہے ہیں۔ سندھ چھوڑ کر کہیں اور ہجرا جائیں گے سندھ خالی کر دیں گے جس طرح کوئی مکان خالی کیا جاتا ہے اور پھر سارا سندھ وہیں مل جائے گا۔ ایک لمحہ کو بھی انہوں نے ایسا نہ سوچا کہ اس طرح دنیا میں کہاں ہوا ہے؟ بدترین فسادات آبادی کی ایک نہایت قلیل شرح کو ہجرت پر مجبور کر دے ہیں ورنہ لوگ تو ایک بار جہاں بس جائیں وہیں رہتے ہیں بیٹی میں ہونے والے تامل مراٹھا

صحت مند ٹریڈ یونین سرگرمیاں نسلی و لسانی بھد کو دور کر سکتی ہیں

فسادات کے بعد شاید چند تامل خاندان واپس تامل نہ
کئے ہوں باقی تامل اسی طرح بیٹھی میں رہتے رہے
پڑے کی چوٹی مصنفوں سے روزی مکتا بہن بیٹا لیس
کے ہونک فسادات ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی نہ
کر پائے۔ لاکھوں مسلمان پاکستان آئے اور کروڑوں وہاں
رہ گئے۔ اور پھر۔۔۔۔۔ ان کے لئے جلتے کو کوئی بچہ
تھی اور ہماروں کے لئے۔۔۔۔۔ بقول ایوب خان۔۔۔
اگے تو سمندر ہے۔۔۔۔۔

مجھے ایک نام نہاد سندھی رہنما کی بات یاد آئی
کتنی نفرت نہ میں سمجھ کر کہہ رہے تھے۔ ہماروں کی
وفا داریاں کسی زمین کے ساتھ نہیں۔ ارے ان سب
کے پاس دو دو پاسپورٹ ہیں۔ تکی سے میں مسکائی تھی
زیادہ تر ہماروں کے پاس دو تو کیا۔ ایک بھی پاسپورٹ
نہیں۔ لیکن یہ باتیں وہ کیونکر سمجھ سکتے تھے کلفٹن اور
ڈیفنس کے جنگلوں میں ان کی زندگی گذری اس میں
جو ہمارے تھے ان کے پاس شاید دو تین پاسپورٹ ہوتے۔
کچھ میں مظلوم قوم کی قوم پرستی میں شاد و غم نہیں
آسکتا۔ یہ بات شاید اتنی سچ نہیں سندھ کے زمینداروں
کی اولاد ایک ایسا طبقہ بنی جس نے سندھی احساس قومیت
کو ایک عجیب رنگ دے ڈالا۔ ڈیروں کے نوجوان
فرزندوں نے سندھ پر یورپی کوئٹہ زمینداروں کے لئے تقریباً
ممنوع بنا دیا۔ دیہاتوں میں جو عرب اور دھوڑس وہ
اپنے کسانوں اور رعیت پر جلاتے وہ انہوں نے کمزوریت
ہمارے نوجوانوں کے لئے مخصوص کر لی اور بھی کیا کیا
حماقتیں ہوئیں یہ نوجوان جیسے مروج کسی احمقوں کی جنت
میں جا رہے تھے یورپیوں میں اجر کا پریم لہرایا اور
سچے کو کبھی سندھو دیش بن گیا۔ ایک دفعہ ٹھٹھ صاحب
کے ایک ہمارے بانی وزیر کو ان کا لیا تھا پھر سچہ نہ آیا کہ
اب ان کا کیا کریں۔ لہذا چھوڑ دیا۔ یہ باتیں یاد کر کے
مجھے ہنسی آگئی۔

بس اب حیدر آباد کی مڑ کوں سے گذر رہی تھی
حیدر چوک آیا۔ چوک کا مینار رنگ اور دھوڑس سے کالا
بڑا ہوا تھا۔ کہتے ہیں حیدر آباد میں سندھی اور ہمارے اپنے
تسلط کی علاقائی جنگ لڑ رہے تھے ہو سکتا ہے کہ وہ
جنگ اپنا اپنا وجود منوانے کی جنگ ہو۔ تسلط قائم کرنے
کی جنگ نہ ہو۔

تھکے ہوئے دماغ نے سوچا۔۔۔۔۔ کوئی کہیں نہیں
جائے گا۔ نہ سندھ سے ہمارے کہیں جا سکتے ہیں۔ نہ کرگچی
سے پٹان اور پنجابی کسی مادے سے غائب ہو جائیں گے
جس کا ہماروں کا مطالعہ ہے۔ ہاں آئندہ کے لئے
روک تھام ضرور ہو سکتی ہے۔ انسان زندگی کا کتنا چڑا
حصہ گذرے زمانوں کو بدلنے کی لا حاصل کرکٹش میں
گزار دیتا ہے۔ انسان اتنا نادان کیوں ہے مجھے ہندوستان
کا صوبہ آسام یاد آیا اور دل میں ہنسی۔ ہاں۔ ہنسی تو سچی
میں (انسان ایسا بھی ہوتا ہے۔ وہ خون خرابہ یاد کر
کے ہنسی بھی سکتا ہے) ایک رات میں آساموں نے
تین ہزار جنگی دہلیوں کا قتل کر دیا تھا اور نتیجہ کی نکلا
آسام میں غیر ملکیوں کا مسئلہ ہنوز چوں کا توں ہے رزق
کے کیڑے پتھروں کی دھاڑوں میں گھسے رزق حاصل کر
رہے ہیں چور غنیوں اور کیڑے کوڑوں کی طرح۔۔۔۔۔
ہمارے اسی برصغیر میں۔۔۔۔۔ ہندوستان سے پاکستان
نہ۔ رزق کی تلاش میں دور دراز کا سفر کرتے۔ آپس
میں لڑتے، ایک دوسرے کو لپچتے کھسکتے خوفزدہ اور
اور غور خوار بن جاتے ہیں۔

اس تقریب میں میں ٹھیک سے کچھ کہہ نہ پائی میرے
لے جو کچھ سندھی ادیبوں نے کہا۔ اسے سن کر، دل کا کچھ
عجب سا عالم تھا۔ کون جانتا ہے ہم کب کسی لاکھوس
نہ میں کسی سرزمین سے پیار کرنے لگتے ہیں۔ کسی علاقہ کی
موسیقی کا کوئی شکر روح میں اتر جاتا ہے۔ کوئی بولی
کب نہیں سمجھ کر کہتی ہے۔ یہ تو دل کے پوشیدہ راز ہیں
محبت ہمیشہ پوشیدہ ہوتی ہے وہ مشتاد بام نہیں ہو
سکتی اور آج مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے دل کی
بے پردگی ہو رہی ہے۔ میں خود ہی کو اتنا جا بستی تھی کہ
یہ تقریب ہو پھر اب یہ فرزند کیوں؟ دراصل اپنے لئے
اتنے دشنام سننے تھے کہ خود کو یقین دلانا چاہتی تھی۔

جس چیز کی ہم آرزو کریں وہ ہو تو جاتی ہے۔ لیکن اس کے
ہونے کا اپنا ہی طریقہ ہوتا ہے ہندوستان میں خواب سا
دیکھا کرتی تھی۔ ایک دن سندھی ادیبوں میں بیٹھی ہوں گی
مڑے دار بایں سون کی ان کی اور ہر شخص سندھی میں
مزاح ہے اس کا لطف اٹھاؤں گی۔ میرے تصور میں اپنا
چہرہ مسکراتا ہوا نظر آتا تھا خوشی سے کھلا ہوا اس طرح اکثر
ضبط کرنے کی کوشش میں تنا ہوا نہیں۔۔۔۔۔ دراصل یہ
موقع میرے لئے شاید بہت سنجیدہ تھا۔ یہ میرا شہر تھا
آج یہاں یہ لوگ اپنے ہی شہر کی بیٹی سے ملنے آئے تھے
مجھے میرے چچا یاد آیا میرے چچے کے خون ریز ہندو مسلم فسادات
یاد آئے۔ جن کے بعد اس شہر کے باسیوں کے لئے دنیا
میں وقوع پذیر ہونے والا ہر مسئلہ صرف ہندو مسلم تنازعہ
کے رنگ میں ہی دیکھا جا سکتا تھا۔

میں سندھی میں بول نہ سکی کیونکہ مانیک برادر مجھے
عسوس ہو رہا تھا کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہیں وقت
پر وہ بات اکثر نہیں کہہ سکی ہوں جس کی مجھے سے توقع کی
تھی یا شاید میرے پاس کہنے کے لئے اس برصغیر کی پوری
تاریخ تھی۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہ بہت
سچیدہ تھا میں نے بہاؤ کی کہوں کی طرح اٹھتے گرتے
جھگڑتے لوگ دیکھے تھے۔ رنگ، نسل، زبانیں، مذہب
اور ان تھوڑے میں بندے ہوئے لوگ، بوڑھے، بچے، مرد
عورتیں، کینے اونچی اونچی لہروں میں بے بسی سے ایک
علاقے دوسرے علاقے میں جا گرتے ہوئے انہو۔ اور
وقفہ وقفہ سے گونجتے ہوئے قہرے۔۔۔۔۔ ہر ہر مہادیو۔۔۔
اللہ اکبر۔۔۔۔۔ لے کر میں گے خالصتان۔ آسام سے
غیر ملکیوں کو نکالو۔۔۔۔۔ مانی پوری ایک قوم ہے۔

میں نے اتنے غرے سنے تھے، پر جوش اور فلک
شگاف۔۔۔۔۔ کہ میں اب کوئی لغز نہیں لگا سکتی تھی۔
ہندوستان میں سات برس رہ کر میں نے صرف یہ محسوس
کیا کہ تاریخ ایک ایسا نتیجہ ہے جس میں پر جوش تالیوں
کی کوئی گنتی نہیں اور یہ تالیوں جب سب جاتی ہیں۔
تو اکثر ان گنت مقتولوں کی زندہ جلائے جانے والوں کی
روانے اور کھلے جانے والوں کی آہ و بکا کو چھاننے کے
لئے ہی سب جاتی ہیں۔

تاریخ نے سندھ کے ساتھ ایک عجیب زیادتی کر
دی اور وہ یہ کہ یہاں غیر سندھیوں کا بہت بھاری تعداد
میں ارتکان ہو گیا اسی لئے کم از کم مجھے اس بات کا یقین ہے
کہ جنگ دیش میں رہتے وہ اسے بہار یوں کو سندھ میں لاکھوں
کی تعداد میں بیکار کرنا انتہائی غیر دانش مندانہ قدم ہوگا۔
اور سندھی ہمارے تعلقات کے حق میں ذمہ قائل ہوگا۔ اس
کے علاوہ یہ نا انصافی بھی ہوگی۔ ضرورت اس بات کی
ہے کہ جنگ دیشی حکومت پر ہر اور اخلاقی دباؤ ڈالا جائے
کہ وہ بہار یوں کو یہاں میں رہنے پر مجبور نہ کریں۔ انہیں

بنگالیوں کے برابر حقوق دیں یہ صرف پاکستانیوں کا ہی
نہیں بلکہ دنیا بھر کے جمہوریت پسند قوموں کا فریضہ ہے
لیکن یہ فریضہ اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن جہاں
تک سندھ میں موجود غیر سندھیوں کا سوال ہے تو تاریخ
کو چالیس برس پہلے کے مقام تک نہیں پہنچایا جا سکتا
نہی سندھ میں بے ہوش پنجابیوں اور پنجابوں کو نکال
باہر کیا جا سکتا ہے۔

سندھ کو تقسیم بھی نہیں کیا سکتا سندھ سے غیر
سندھیوں کا اخلا یا سندھ کی تقسیم یہ دوڑوں ایسی ہی ناکام
ہیں۔ جو بغیر کسی وجہ کے ۱۹۴۷ء کے پیمانہ کے جنگ مر کے عمل
میں نہیں آسکتیں نہ ہی یہ جواز کچھ حقیقت رکھتا ہے
کہ پنجاب جیسے بڑے صوبہ کی موجودگی میں چھوٹے صوبے
پاکستان میں یقیناً محکوم رہیں گے۔ اگر ہندوستان میں
نئی پورہ جیسی نئی نئی ریاست اتر پردیش جیسے عظیم و
کے ساتھ رہ سکتی ہے کہ جس کی آبادی کل پاکستان کی
آبادی سے زیادہ ہے تو سندھ اور بلوچستان بھی ایک
بڑے صوبے کے ساتھ یقیناً رہ سکتے ہیں۔ ضرورت صرف
ایک یا مینی، موثر اور کارگر وفاقی نظام کی ہے اور ساتھ
ہی یہ یاد رکھنے کی کو فاق میں مثال پوتوں کے لئے
مرکزی بالادستی کو روکنے کے لئے مسلسل چوکتا اور
مستعد رہنا ضروری ہے ورنہ بڑوں کی تو عادت ہی ہوتی
ہے کہ بعض اوقات چھوڑوں پر بے خیالی میں ہی
پاؤں دھرتے ہیں۔

ہماروں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کی
دوسری قومیتوں کے برعکس ان کا سب سے اہم مسئلہ
اقتصادی نہیں بلکہ نفسیاتی ہے ہماروں میں غریب طبقہ
بھی موجود ہے لیکن کسی بھی دوسری قومیت سے مقابلہ
کریں تو ہماروں میں کھاتے بیٹے طبقہ کا اتنا سب شاید
زیادہ ہی ہو سکے۔ ہماروں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے
کہ پاکستان میں ان کا رول کیا ہے۔۔۔۔۔ وہ کون ہیں
جب کہ یہاں سب لوگ سندھی، پنجابی، بلوچ، پنجاب
وغیرہ ہیں اور ان کے اپنے اپنے علاقے بھی ہیں تو پھر
ان کی سرزمین کہاں ہے؟ وہ پاکستان کہاں ہے جہاں
انہوں نے اپنے آبائی علاقوں سے ہجرت کی ہے؟

درحقیقت ہجرت کرتے ہوئے پاکستان کا جو تصور
ان کے ذہن میں تھا اور پاکستان کی جو ذیل حقیقت
ہے اس میں تھوڑا سا فرق خفا ضرورت حقیقت کے
مطابق تصور میں ترمیم کرنے کی ہے اور حقیقت یہ بنی
ہے کہ پاکستان تو ہمارے پورے ملک کا نام ہے مگر
ہمارے اب پاکستان کے صوبہ سندھ میں آکر رہے ہیں۔
آئین اور وفاقی کے اصولوں کے لحاظ سے اب وہ سندھی
ہیں اور اب سندھ میں وہ بڑی ثقافتی اکائیاں آباد ہیں
یہ ہے وہ حقیقت جس سے ہماروں اور سندھیوں دونوں
کو کھی بھرت کرنا پڑے گا۔ اور یہ گڑبڑ گولی سندھیوں کو
بھی لگتی ہے۔ سندھ کی آنے والی تاریخ کا روح
سندھی اور ہمارے دونوں مل کر ہی متعین کر سکتے ہیں۔

اس بات پر سندھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ نا انصافی ہوگی۔
سندھ کے وارث تو سندھی ہیں۔ اس کی تقدیر کی
تقریر صرف ہمیں ہی کرنی چاہیے۔ تو پھر دوسری صورت
میں آپ ہماروں کو کس طرح رکھنا چاہیں گے؟
کہ لاکھوں ہماروں کو یہ حقوق شہری بنانا لینا کریں
گے؟ اگر نہیں۔۔۔۔۔ اگر ان کے دی شہری حقوق ہیں
جو سندھیوں کے ہیں تو اسی صورت میں وہ حقوق خالی
بھی ہوں گے اور ان کے ساتھ قدم قدم پر مفاہمت

بھی کرتی پڑے گی۔

لیکن یہ ایک طویل، سست رفتار عمل ہے۔ طویل اور سست رفتار مفاہمت ہی اس مسئلے کو انہیں طریقہ پر حل کرے گی۔ یہ ایسا عمل ہے جس میں پرجوش نعروں اور گونجدار تالیوں کی کہیں گنجائش نہیں ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ماضی میں دیہاتوں میں سندھیوں اور شہروں میں مہاجرین کے ارتکاز کا رجحان کافی نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ شہروں میں سندھیوں

کو متحرک کرنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم آئندہ دس برس تک صنعت کاری اور کاروبار شروع کرنے میں سندھیوں کو خصوصی رعایتیں اور آسانیاں فراہم کی جائیں۔ سندھ کی زرعی معیشت کو جدید بنایا جائے اور صدیوں پرانے اذکار رفتہ و تفری نظام کو زراعت سے وابستہ صنعت کاری اور سرجمارت کے یکسر میں ڈھالا جائے۔ غیر سندھیوں کو احساس محرومی سے دور رکھنے کے لئے سندھ میں ترقیاتی کام کو اتنی وسعت دی جائے

جس میں غیر سندھیوں کی بھی کھیت ہو سکے دوسرے صوبوں خصوصاً پنجاب کو دل پر بھجور رکھ کر کم سے کم دس برس تک قومی خزانے سے سندھ کے لئے خصوصی فنڈ ہیا کرنا چاہیے۔ وفاق پاکستان کے حق میں یہی بات جانی ہے۔ علاوہ ازیں سندھ کے وسائل سے پیدا ہونے والی دولت سندھ میں ہی خرچ کی جائے اس پرانے جائز مطالبہ کو تسلیم کر لیا جائے یہ چند ممکنات ہیں جو سندھ کے تہیہ مسئلہ کو دھیرے دھیرے سمجھانے میں مدد کر سکتے ہیں۔

ترک اسلحہ کے بغیر انسانیت کو درپیش مسائل سے نمٹنا ناممکن ہوگا

جوہری جنگ اور تیسری دنیا کے عوام ابن لطیف

ترک اسلحہ کے بغیر آئندہ صدی میں انسانیت کو درپیش مسائل سے نمٹنا ناممکن ہوگا۔ کیونکہ ایسی ہتھیاروں کی ایجاد کی وجہ سے عصر حاضر میں نئی نوع انسان کی بقا سے زیادہ کوئی دوسرا مسئلہ اہم نہیں رہا۔ ان خیالات کا اظہار سوویت صدر گورباچوف نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۳۴ ویں اجلاس میں اپنی تقریر کے دوران کیا۔

دنیا میں جب تک جوہری اسلحہ موجود ہے ایسی جنگ اور اس کے نتیجے میں انسانی نسل کی مکمل تباہی کے امکانات بھی موجود رہیں گے کیونکہ ضروری نہیں کہ ایسی جنگ کسی سیاسی بحران کے نتیجے میں جھڑکے بلکہ اس کا آغاز غلط یا کسی آئے کی غلطی کی بنا پر غیر ارادی طور پر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر خود بخود آئینی جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں تو حالات پر قابو پانے کے امکانات تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوں گے کیونکہ ایسی نقصان کا دوا نیا نظام مختصر ہوگا۔ جوہری جنگ نہ صرف اس میں براہ براہ راست ملامت ممالک کے لیے موت کا پیرغام ہوگی بلکہ دنیا کا کوئی بھی ملک اس قیامت سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ اس وقت دنیا میں جوہری بموں (وار ہیڈز) کی تعداد ۵۰ ہزار سے زائد ہے جبکہ ان کا صرف پانچ فیصد کرۂ ارض پر سرحدی راج کو نیست و نابود کرنے کے لیے کافی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ایسی حملوں کے ابتدائی تبادلوں کے بعد فوجی کاروائیوں کے لیے شاید ہی کوئی نذر ہو سکے۔

ایسی جنگ کے اثرات محض نسل انسانی کے خاتمے تباہ کاریوں اور تباہ کاری کے سان بڑا اثرات تک ہی محدود نہیں ہوں گے بلکہ موجودہ ٹیکنالوجیوں کے نتیجے میں صرف ایک فیصد کے احتمال سے کرۂ ارض کے موسم میں اتہا میں تباہ کن اور ناقابل ترمیم تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ مشہور سائنس دان پینچوک کے انداز کے مطابق ایسی جنگ سے کرۂ ارض کے موسمی حالات میں رونما تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی بھوک کے نتیجے میں مرنے والوں کی تعداد براہ راست ایسی حملوں کا شمار لوگوں کے مقابلے میں آگنا زیادہ ہو سکتی ہے۔

ایسی جنگ سے موسمی تبدیلیوں کے سب سے تباہ کن اثرات کرۂ ارض کے استوائی علاقوں پر مرتب ہوں گے کیونکہ اس خطے کے لوگوں میں درجہ حرارت میں شدید تبدیلیوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت دوسرے علاقوں کے لوگوں کی نسبت کم ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر ایسی جنگ یورپ یا شمالی امریکہ میں محدود پیمانے پر بھی لڑی جائے۔ تو اس کی بدولت کرۂ ارض کے موسمی حالات پر تباہ کن اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ یورپ یا امریکہ میں ایسی جنگ سے جنوبی و مرکزی امریکہ

افریقہ اور ہندو ملایا کے علاقے میں جنگلات تباہ ہو جائیں گے اور یہ تمام علاقے تقویتی صحرائیں تبدیل ہو جائیں گے اور ساحلی استوائی خطوں کے جنگلات کا بھی تقریباً یہی حشر ہو سکتا ہے۔ ایسی جنگ کی بدولت زراعت کو بھی ناقابل تلافی نقصان کا خدشہ ہے۔ مشہور سائنس دانوں باروئل اور پینس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”ایسی جنگ کے ماحولیاتی اثرات“ میں اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ایسی جنگ کے نتیجے میں درجہ حرارت میں قلیل عرصے کے لیے بھی کمی واقع ہوتی ہے تو استوائی خطے میں زرعی فصلوں کا بہت بڑا حصہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ چاول کی فصل تو درجہ حرارت میں محض ۱۵ ڈگری سٹی گریڈ کی کمی سے تباہ ہو سکتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جوہری عالمی جنگ سے براہ راست متاثر ہونے والوں کے جسمانی مہائب اور ذہنی اثرات میں قحط اور خوراک کی نایابی کی بدولت مزید اضافہ ہوگا کیونکہ ان آفات کے اثرات اس قدر زیادہ ہوں گے جن کا آج تصور بھی ناممکن ہے۔ محیط ترین تجربوں کے مطابق اعلیٰ چین کی آبادی کا پانچ حصہ قحط سے ہلاک ہو جائے گا علاوہ ازیں انڈونیشیا، کمبوڈیا، کوسٹاریکا، نائجیریا اور فلپائن جہاں خوراک کے ذخائر خالص محدود ہیں بھی آبادی کا خاصہ بڑا حصہ خوراک کی نایابی کے باعث موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ اور بعض اندازوں کے مطابق جو کہ جاپان اپنی زرعی ضروریات کا پورا حصہ درآمد کرتا ہے اس لیے ایسی جنگ کے نتیجے میں عالمی زراعت کو جو نقصان پہنچے گا اس کی وجہ سے ان ملک کی آبادی ۵۰ سے ۹۰ فیصد تک ہلاک ہو سکتا ہے۔ ماہرین نے ۱۵ ممالک میں خوراک کی صورت حال کو ملاحظہ رکھتے ہوئے یہ اشیوں ناک نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایسی جنگ کی وجہ سے پیدا ہونے والی غذائی قلت سے کرۂ ارض پر ایک سے چار ارب انسان موت کی بھیئت چھو سکتے ہیں۔

وہ دن دور نہیں جب ایسی جنگ کی ”فتح“ کے خواہش مندوں کو عالمی رائے عامہ کے سامنے کھٹے ٹیکنے پڑیں گے۔

جوہری جنگ کے نتیجے میں عالمی معاشی نظام مکمل طور پر تباہ ہو جائے گا اور نئی نوع انسان متزلزل کا شکار ہو کر قرون وسطیٰ کی سطح تک پہنچ جائے گی۔ مشہور فرانسیسی معیشت دان پے وں لاڈلان نے اپنی کتاب ”جوہری جنگ کے معاشی اثرات“ میں لکھا ہے کہ جوہری عالمی جنگ کے

سب سے تباہ کن اثرات ترقی پذیر ممالک پر مرتب ہوں گے کیونکہ وہ غذائی اجناس اور تکنالوجی میں ضروریات کا بڑا حصہ درآمدات سے پورا کرتے ہیں۔ لاڈلان کے اندازوں کے مطابق شمالی نصف کرہ میں ۵۰ کروڑ افراد اور جنوبی نصف کرہ میں ایک سے تین ارب لوگ ایسی جنگ میں زندگی کی نکت سے محروم ہو جائیں گے۔ اور یہ لوگ ایسی بموں کے دھماکوں سے ہلاک نہیں ہوں گے بلکہ ان کی ہلاکت کی وجہ بھوک، بیماریاں، بد انتظامی اور شہروں میں فسادات ہوں گے۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اناج کے اہم برآمد کنندگان امریکا، کینیڈا اور فرانس سب سے پہلے ایسی تباہی کا شکار ہوں گے۔ جن کی وجہ سے اناج کی عالمی منڈی تیس تیس ہونے لگی۔ دوسری جانب تیسری دنیا کے ممالک سے تیل کی فراہمی قحط ہو جائے گی اور یہ ممالک آمدنی کے اہم ترین ذریعے سے محروم ہو جائیں گے۔ تیل کی فراہمی رک جانے کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک کی صنعت، مفلوج ہو کر رہ جائے گی اور ترقی پذیر ممالک سازوسامان، غذائی اشیاء اور کھادوں سے محروم ہو جائیں گے۔ امریکی سائنس دان مارک باروئل کا کہنا ہے کہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ جوہری جنگ سے موسمی تبدیلیاں رونما نہیں ہوں گی تو پھر بھی صرف ایندھن اور کھادوں کی نایابی کی وجہ سے زرعی اجناس کی پیداوار میں ۵۰ فیصد کمی واقع ہوگی اور دنیا میں وسیع پیمانے پر بھوک کا تگر ہو جائے گی۔

ان حقائق کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ملک ایسی جنگ کے تباہ کن اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور کرۂ ارض کی آبادی کا پورا حصہ موت کی یمنہ سوجائے گا اور یہ نتیجہ اخذ کرنے کی تمام بات موجود ہیں کہ ایسی تصادم کیوجہ سے انسانی تہذیب اور معاشرہ موجودہ شکل میں اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکے گا۔ اور جوہری جنگ کے بعد اگر کچھ لوگ زندہ بچنے میں کامیاب بھی رہے تو ان کے لیے خود کو تبدیل شدہ حالات کے مطابق ڈھالنا ناممکن ہوگا اور وہ رفتہ رفتہ تباہ کاری، دوائی امراض، بھوک اور سردی کا شکار ہو کر بقیہ اہل بین جائیں گے۔ شاید ہی وہ جسے کہ آج دنیا میں جوہری اسلحہ کی دوزخ کو ختم کرنے اور موجودہ ایسی ہتھیاروں سے چھکارا حاصل کرنے کے لئے جاری جدوجہد میں زیادہ لوگ شامل ہو رہے ہیں تاکہ نئی نوع انسان کو ایسی جنگ کی صورت میں اجتماعی خودکشی کے پالگن سے بڑھا جائے اور وہ دن دور نہیں جب ایسی جنگ میں ”فتح“ حاصل کرنے کے خواہش مندوں کو بھی عالمی رائے عامہ کے سامنے کھٹے ٹیکنے پڑیں گے۔



آخری بوند کی خوشبو

زالہہ حنا

پھانی کے تختے پر ڈولہا بننے والوں کے ناموں کی ایک کہکشاں تھی

پہلوں کی واپسی شروع ہو گئی تھی۔ ان کی اڑان سے آسمان پر آؤں تری کیسے بکس رہی تھیں ہوا مہستہ آہستہ چندن پانیل اور نیم کے پیڑوں میں خوب ہو رہی تھیں۔ واپس ہونے والوں کی آوازوں کے گھنگھرو، بقی کے تمام آنکھوں میں بچ رہے تھے اور اڑان سے شک کر ٹوٹ جاتے والے ان کے گرم پر ہوا میں دائرے بناتے

ہوئے زمین پر گر رہے تھے۔

سینچل فیکر کی آواز دوپارہ کیوں پر سے آئی دل مورے مول دوست کا ڈیرا، سائیں کا ڈیرا، غلب کے بیچ ہے کبھی جو تہ تیغ پیچہ جمل، سن ماہیں تیرتھ میرا، دوست کا ڈیرا سائیں کا ڈیرا، اس کی پیسوز اور پاسے دار آواز اکتا لے کے کی

تن تن پر چھائی ہوئی تھی اور ریگستانی ہوا کے آہنگ کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

یہ آہنگ سائیں فین بخش کے سینے میں نیچے کیانی کی طرح اٹرا تو انہوں نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا۔ آہیں محسوس ہوا کہ سیاہ بفقوں والے زردی سائل کا نڈر پردھندلا ہٹ کی راگہ جتنے تھی ہے اور دقت آگیا ہے کر وہ اپنے آپ کو مٹتی کے بازار سے واپسی پر غرض ادا کیڑوں اور دانش جو نکلنا موں کی کچھری سے آٹھنے پر آمادہ کریں۔

سینچل فیکر کی آواز دور دور جانے لگی، ہنس کی ڈوٹی ہوئی آواز کی طرح۔ وہ نواب بھاری کا عاشق تھا اور عموماً اپنی کا لاکم کا تاتا تھا۔ کبھی سندھی میں، کبھی ہندی میں۔ دل مورے بول دوست کا ڈیرا، سائیں کا ڈیرا۔ انہیں پھر پھر سی آئی اور انہوں نے سر جھٹکے کر و پیش پر نظر کی باہر کی شام کا تاریخی پن ان کی اوطاق تک پہنچتے پہنچتے سرخی غبار میں گیا تھا اور سر جھٹکے اور پھیلتی جا رہی تھی۔

روزی طرح انہیں اس وقت بھی حیرت ہوئی آتی جلدی؟ یہ اندھیرا چھاتی جلدی کر آیا باکھوں نے ایک آہ بھری، چارخ کے انتظار میں بیٹھے کے نیچے سے مور کا پھٹا سا پر نکلا اور اُسے ششوی کے چہرے دھڑکیں رکھ دیا۔ دن کی روشنی میں اس کا طوطی رنگ کی چھب دکھانا ممکن اس وقت تو وہ بھی سیاہ نظر آ رہا تھا، پھر حقیقت کیلے ہے؟ دن کی روشنی میں اس کے سارے رنگ یا بھٹنے کے سہے اس کی سیاہی؛ لیکن حقیقت شاید کہیں بھی نہیں!

انہوں نے ششوی کے چہرے کو اپنے پلنگ کے برابر رکھے ہوئے صدق پر رکھا تو ان کا ہاتھ ایک اور کتب سے چھو گیا۔ یہ شاہ جو رسالو تھی۔ گویا ان کے ہاتھ نے اپنی گزشتہ اور آئندہ مجوں کو چھو لیا تھا۔ یہ ان کا معمول تھا کہ صبح کا آغاز وہ شاہ جو رسالو سے کرتے اور ان کا سینہ اپنے پن سے بھر جاتا۔ پھر دوپہر بھل جاتی اور ان کا دل عشق، جبر و قدر، وحدت الوجود اور وحی و الہام کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لیے بیتاب ہو جاتا اور سائیں فین بخش ایک ایسے شکاری بن جاتے جو پہلے کمرن کے نقش قدم کو بھٹاتا اور اس کے نقاب میں چھپتا چلا جاتا ہے اور جب اس کے نقش قدم بھٹنے لگا جاتے ہیں، نظر نہیں آتے تو ناٹا ہو کر خوشبو کا دامن مقام کراس کی سمت بڑھتا رہتا ہے۔

ہجومیادے سوئے افکار شد

گام آہو دید و بر آثار شد

چند گاہش گام آہو درخور است

بعد ازاں خود ناف آہو رہبر است

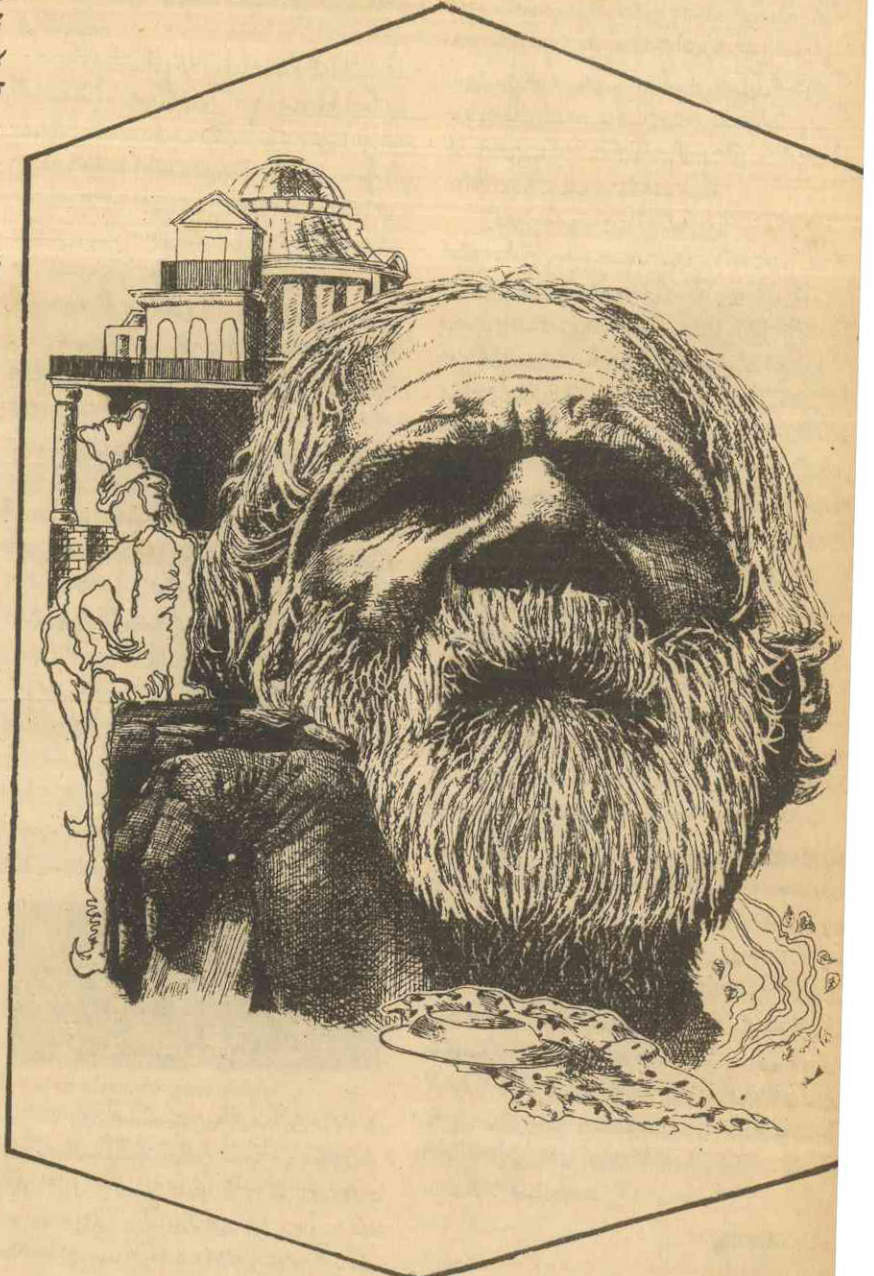
وہ ان اشعار کو سینکڑوں بار پڑھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ وہ آج بھی حقیقت و معرفت کے سرن کی تلاش میں چلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس سفر کا تاثر نہیں تھا اور یہی اس کا حاصل تھا۔

دلیز پر چڑیاں بھیں اور روشنی کی لکیر کھینچ گئی انہوں نے اپنے تہ تیغی کو دیکھا، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اوطاق چراغ کی روشنی سے بھر گیا ہے یا نور کی چہرے کی دمک سے۔ وہ ملاقاتیں چراغ رکھ کر ان کے پاس آئی اور انہوں نے اُسے اپنی ہاتھوں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔ بیٹی کا ماپ ہونا کسی نعمت تھی، کیسا عذاب تھا۔

ایمانک سارا کر و پیش اوٹوں کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازوں سے بھر گیا۔

بابا یہ اس کے کون سا قلند ہے؟؛ نوری نے قدر سے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

ہمیں کیا بیٹا۔ کہیں سے آئے ہوں گے، کہیں چلے جائیں گے۔ ہمیں نہ لوگوں کے آنے سے عزم، نہ ان کے



جانے سے ملاتے، انہوں نے چراغ کی شہر کی تھی اور پرتنگوں کا رقص دیکھا۔

دل مورے مول دوست کا ڈیرا، سائیں کا ڈیرا

تقسیم کیا گیا تھا جس کی اختتامی سطر میں انہیں آج بھی یاد تھیں۔
لہذا حکومت انگریزوں کو اطلاع کرتی ہے کہ میرزا علی
خال کو ان کے عہدہ ریاست سے برطرف
کیا جاتا ہے اور تمام ملک سوا اس کے علاقے
کے جو میرزا علی خاں سے انہیں وراثت میں
ملے ہیں، انگریزوں کے علاقے میں شامل کیا جاتا ہے
پس تمام رہائیاں جو ان علاقوں میں رہتی تھیں وہ آئندہ
سے اپنے آپ کو انگریزوں کی حکومت کی رہائیاں سمجھیں
اور اس کے احکام و قانون کی پابندی کر کے رہیں گے۔
کسی قسم کا مزہ نہ پہنچے گا۔

یہ اور اس قسم کی توہین آمیز دوسری دستاویزات کا ایک
ایک نمونہ تھا۔ اور اس غلطی اور ذلت اور آج بھی کرب کا اظہار
وہ اپنے شاگردوں کے سامنے اور اساتذہ کے درمیان
بیٹھ کر کرتے۔ یہ باتیں سہلا س کی چھی ہیں جو ان کی دھڑکی
رہتیں۔ چند سال کی طرح گزر گئے لیکن میرزا علی خاں کو
احاطے سے باہر نہ نکلتے تھے۔ انہی دنوں ان کا اٹھنا بیٹھنا بھی
ان لوگوں میں زیادہ ہوتے لگا جو انگریز حکومت کے دشمن
جاتے تھے اور کھلے کھلے بات کرتے تھے۔

بات اڑی اڑی حکمرانوں کے اعلیٰ افسروں کے پاس بھی
پھر ایک روز ڈائریکٹریٹ کے دفتر میں ان کی طلبی ہوئی۔
ماسٹر فیض بخش جراتی کے جوش میں جھریے ہوئے اور معلوم
کی رسیوں سے بندھے ہوئے وہاں پہنچے۔ سوال شروع ہوئے
تو انہوں نے بہت گھما پھرا کر جواب دیے لیکن انگریز ڈائریکٹر
جب اس حقیقت کو پایا کہ بات وہیں درست ہے جو اس ملک پہنچی
ہے تو دیکھے بے میں باتیں کر کے اس نے انہیں رخصت کر دیا۔

ماسٹر فیض بخش انگریزوں کی رگ رگ سے واقفیت کا دعویٰ
رکھنے کے باوجود اسے نہیں جانتے تھے۔ وہ اس ملاقات سے
خاصے مطلب سے ہوا کر گئے۔ اس رات گھر کے آگن میں بیٹھ
کر وہ دیر تک سات ستاروں کے چکر چمکے کو دیکھتے رہے اور
تھیں بنات الفش گردوں دن کو پہنچے نہ تھا

شب کو ان کے جی میں کیا آکر میراں ہوئیں
نگھٹاتے رہے۔ ستاروں کا گلابا جب ان کی آنکھوں
میں خوابوں کی وحشتوں کو اترنے لگا تو انہوں نے کوٹہ بدل
کر اسے دیکھا جس کا سنو لایا ہوا لیکن بدن ان کی خواہشوں کا
رہنا تھا اور وہ اس کی سیر کو نکل گئے۔

کئی دن گزر گئے۔ انگریز ڈائریکٹر کی طبیعت نے خوشی پیدا
کی تھی وہ ذہن کے کسی دور افتادہ گوشے میں جا سوئی۔ اس روز
جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علموں کو کلاس کے ٹیبل
ہول کے بارے میں پڑھا کر اور اس پر غور کرنے کی حقیقت
انہیں سمجھا کر غصے تو اس کو لکھ چھٹ پر چلے گئے کیونکہ ان
کا اگلا تھکا خالی تھا چھٹ سے انہیں قدرے دور پر پہنچا ہوا
سندھو نظر آ رہا تھا۔ سندھو کی دھوپ سندھو کی ہواؤں میں رل مل
گئی تھی، شہر کے در و دیوار سے پٹی ہوئی تھی اور ہواؤں میں
دو پہر کے پتے ہوئے پتے کے کیمن خوشبو تھی۔ زندگی خوشبو
تھی اور آئندہ بھی خوبصورت رہنے کے تمام امکانات کھتی تھی۔

تب پٹے والا انہیں ڈھونڈتا ہوا تھا پر چلا آیا۔
ہریداس ماسٹر صاحب نے انہیں بلایا تھا۔ وہ بوسکی کی گھیس کے آن
دو آؤ پری یوں کو بند کرتے ہوئے سیر تھا ان کے لئے۔
جنہیں انہوں نے گرمی کے سبب چھت پر پہنچ کر کھول دیا

نوری ان کے تھریب پلنگ پر بیٹھ گئی اور تیرہ بھی ہوئی
یوسیدہ چادر کی سلوٹوں کو اپنی انگلیوں سے نکالتی کوشش
کرتی رہی۔ وہ جانتے تھے کہ نوری اس لئے اس طرح کیوں بیٹھی ہے
لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ جب انسان کچھ بھی نہ کر سکتا ہو
تو خاموش رہنے کے سوا وہ اور کیا کر سکتا ہے؟ اظہارِ رات ہی
ختم ہو گیا تھا۔ صبح اور دوپہر کو ان دونوں نے کھٹی ہیر کھجور اور مکئی کے
بجٹے ہوئے دانوں پر کڑا کیا تھا۔ نوری کا کھانا چھوڑا تیار ہوا تھا کباب
گھونچ کچھ نہیں رہا ہے

نوری بھی رنکدہ بیٹھے رہے۔ ان کے درمیان خاموشی کی لگتی
کھینچی رہی اور اس پر نہ بولے جا سکتا دے جلوں کے کٹے چٹے ٹکڑے
بچے چھڑاتے رہے۔ چراغ کی نور پتنگوں کا رقص جاری رہا۔ یہ
روشنی دیکھتے ہی جانے کہاں سے چلے آتے ہیں اور اتنے دھڑکی شوق
سے مرتے چلے جاتے ہیں جیسے مر جانے میں ان کی زندگی ہو اپنے
خیال پر انہیں بھر پوری سی آتی۔

خاموشی میں ناخواب برداشت ہو گئی نوری کی اٹھ اور اطلاق
سے باہر چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس کی چوڑیاں بھی خاموش رہی
تھیں۔ دل کھنگلی نے انہیں نڈھال کر دیا۔

انہیں وہ دن یاد آئے جب وہ ماسٹر فیض بخش کہلاتے
تھے اور جوانی کے منہ زور گھوڑے پر ان کی سواری ٹی ٹی تھی
بہت سے دوسرے سر پرے نوجوانوں کی طرح وہ بھی آزادی
کی پری پر فدا تھے اور یقین رکھتے تھے کہ انگریزوں کا جانا اور
اس پری کا ہاتھ آنا میں ہوں اور دونوں کی بات ہے۔ ان دنوں
وہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد سکھر کے ایک اسکول میں تاریخ
پڑھاتے تھے اور شاگردوں کو صحیح تاریخ پڑھا کر نیت و ستان
کی تاریخ بدل دینا چاہتے تھے۔

وہ جب کلاس روم میں کھڑے ہوتے اور شاگردوں کی
متجسس، ذہین اور حیران نگاہیں ان پر جمی ہوئی ہوتیں تو
نصاب کی کتاب میں کھٹے ہوئے لفظ ان کی نگاہوں کے
سامنے سے چڑیاں بن کر اڑ جاتے۔ فتح سندھ پڑھاتے
ہوئے ان کا دل بالاد پر آئے ہوئے سندھو کی طرح کناروں سے
چھلک پڑتا اور وہ بھول جاتے کہ نصاب کی کتابوں کے صفحوں پر انگریز
فاطمین کے بارے میں کیا کیا قصیدے لکھے ہیں۔ تلخہ امام لاد
کی فتح، جنگ میانہ اور دوسری جنگیں پڑھاتے ہوئے وہ کرل
برائیکٹر برنس، سر جیلس جینر، جیٹ اور سر جی بارٹل فیلورڈ
فریڈ کی بدعہد یاد، سازشیں اور حکلاقی رشہ و دانیان بیان
کرتے تھے۔

میراں سندھ کی شکست کا دماغ ان کا سیدھا حلا تھا۔
بیمات میراں حیدر آباد کی وہ عرض داشت انہیں نوک زبان
تھی جو انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کو ارسال کی تھی۔ اپنے شاگردوں
کو یہ عرض داشت سناتے ہوئے وہ جب ان سطروں پر پہنچتے

ہم لاجپاتہ زور و قوت سے غم و ہر حال میں
نیوہ کی آمد کے وقت اپنے محلات میں مقیم تھیں۔
خدا جانتے ہیں کہ کون سی شرافت تھی کہ ہمارا
رہائش گاہوں میں داخل ہو گیا اور ہمیں اس طرح
لوٹا کر زندہ رہنے کے واسطے ایک ننگا چھوڑا
پورے دو سال گزر چکے ہیں کہ جب اُس نے
ہم کو اپنے مکانات اور آبائی شہر سے بھر
کیا اور مجبور کیا کہ ہم حیدر آباد سے باہر چھوڑ دیں۔
میں مثل خانہ بدوش کے رہیں۔

توان کی آواز گونج رہی تھی اور اپنے آنسو وہ مشکل ہی پتے
اسی طرح حکومت انگریزوں کا وہ اشتہار تھا جو میراں مراد
خاں کی محنتوں کے لیے جاری کیا گیا تھا اور جیسے ان کی رہائش

تھا۔ وہ ہریداس ماسٹر کے کمرے میں پہنچے تو خاکستری رنگ کا
ایک نقاشی کا منظر تھا۔ اس نقاشی میں ان کی برطرفی
کا پروانہ تھا۔

انگریزی میں ٹاپ شدہ چند سطروں نے ماسٹر فیض
بخش کی زندگی کے زمین و آسمان بدل دیے۔ شروع شروع
میں تو انہیں یہی خیال رہا کہ خدا کا شکر ہے انگریز کی غلامی سے
نجات ملی لیکن غلامی سے نجات پانے کی جو قیمت انہوں
نے ادا کی تھی، وہ حیدر آباد کی استقامت سے زیادہ
ثابت ہونے لگی۔ وہ تنہا ہوتے تو انہیں دوسری بھی انہیں
نہ ہوتی لیکن دیرس کی پیاس ہی ہوئی بیوی اور چند بہنوں
کی نوری ان کے لیے سزا بن گئیں۔ بیویوں کی عزت نے
مناعت پسند کی کوٹوں کے مزاج کا حصہ بنایا تھا لیکن
مشکل یہ تھی کہ ماسٹر فیض بخش کے پاس چند گھنٹے زمین بھی
نہ تھی کہیں پر پل بیل کے کھڑے ہو جاتے اور سال بھر
کا اتان اگا لیتے۔

انہوں نے سکھر سے حیدر آباد تک بہت بھاگ دوڑ کی، پانیوں
پانی اسکول کو ایک طرف رہے، پرائمری اسکول کی دہلیز بھی بھول
لے ڈالی لیکن ملازمت ان کے لیے مینہ سے بھرا ہوا وہ بادل
بن گئی جو بھولے سے بھی محراب سے نہیں گزرتا۔

ان کا اٹھنا بیٹھنا عید اللہ سندھی کے چند معتقدوں میں بھی
تھا۔ یہ لوگ دوسروں کے لیے عجوبہ تھے کیونکہ جب دیکھتے تھے
بکس اٹھاتے اور دوسری میں شکر لپیٹے ہوئے سفر کے لیے تیار
رہتے تھے۔ انہیں سے ایک شیخ عبدالقدوس تھے۔ وہ
دیشی رومال، تحریک سے وابستہ رہے تھے۔ انہوں نے ایک
مرتہ ماسٹر فیض بخش کو بتایا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس عسکرانی
دیشی رومال کو دیکھ چکے ہیں جو یلورنٹ پیاجا جیٹا والا تھا جس
پر عربی عبارت، مولوی عید اللہ سندھی نے خود اپنے ہاتھوں سے
کاٹھی تھی اور جسے انہوں نے اپنا پر لپٹ کر لپٹ کر لپٹ کر لپٹ کر
اپنے معتد خاص شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی کے سپرد کیا تھا
شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی اس رومال مناسط کو کسی
معتبر حاجی کے ذریعے شیخ الہند کو حجاز بھیجوانے والے تھے کہ انہوں
نے تجھ کی، رومال خود کے ہاتھ لگاؤ اور اس پر کراہی ہوئی کال کے
ساتھ 14 فروری 1914 کو مندرستان پر چلے کے منسوب کیے کہ قادیان
کو یوں لکھا گیا۔

شیخ عبدالقدوس سے ماسٹر فیض بخش کو رابطہ خاص تھا۔
جب انہوں نے اپنی پریشانی کئی بار شیخ عبدالقدوس سے بیان کی
تو انہوں نے ماسٹر فیض بخش کو سمجھایا کہ سرکاری نوکری سے برطرفی
کا مطلب یہ ہے کہ سرکار تم سے ناراض ہے ایسی صورت میں تمہیں
جیان پہچان کے لوگوں میں نوکری ملنے سے بھی تمہارے لیے
بہتر نہیں ہے کہ کچھ دنوں کے لیے سکھر چھوڑ دو اور کسی دور دراز علاقے
میں اپنی قسمت آزمائو۔

سکھر چھوڑنے کا مشورہ سن کر ہی ماسٹر فیض بخش کو گھبرایاں
سی آئیں۔ اب یہ پیمبری وقت بھی ان پر پڑنا تھا کہ روزی روزی
کے لیے اپنی پیمبریوں ان کا گھر و زرک کرے اور کسی پرانی زمین
پر کسی نئے آسمان کے نیچے جا کر رہیں انہوں نے اس مشورے سے
گھبرا کر مفتوں شیخ عبدالقدوس کے گھر لگے ہیں کیا لیکن مانگے
تا گنگے کی روٹی پر صلا کہ کسی کی زندگی گزری ہے جو ماسٹر فیض بخش
کی گزرتی۔ چند ہی دنوں میں گھر کے در و دیوار سے بھوک کی
لپٹیں اٹھنے لگیں۔ سفید لٹکی تھلاؤں پر ڈل گھبراؤں کی تعین
اور اس پر زمین کا کوٹ پینٹنے والے خود دار اور خوشناس ماسٹر
فیض بخش کا سارا وجود ان لپٹوں سے چھلنے لگا۔

آخر کار ایک شام جب دوسرے گھروں میں چراغ جل اٹھے تو وہ
سر ہلکے ہوئے اپنے گھر سے نکلے اور شیخ عبدالقدوس کے پاس
جا پہنچے۔ شیخ عبدالقدوس نے بتایا کہ وہ دن الیحد سفر پر نکل رہے

میں، اگر وہ چاہیں تو ان کے ساتھ چل نکلیں۔ اللہ بڑا مہربان ہے۔
 ہے، لیکن نہ کہیں کچھ نہ کچھ پورے گا۔

”لیکن شیخ صاحب، آخر کچھ تو بتا لے کہ کیا کہاں ہے؟“
 ماسٹر فیض بخش نے گہرا کہ شیخ عبدالقدوس کی شکل کبھی
 نہ بھولے گا، وہ جیسے ہی اس سے ملے گا تب ہی کو کہیں
 پہنچے گا، انہوں نے فلسفیانہ انداز میں کہا اور اپنے قلم
 میں قلم لگانے میں مصروف ہو گئے۔

ماسٹر فیض بخش چوتھی دیر سے کھانے ان کے پاس بیٹھے تھے
 پھر منہ ٹکائے ہوئے تھے واپس آ گئے۔ وہ تمام رات انہوں نے
 ملنے بیٹھے اور اپنے گھر کے آگے میں بیٹھے تھے گورنری، یہ
 مکان بھی اب انہیں جلد ہی خالی کر دینا تھا کیونکہ کئی جیسے سے وہ
 اس کا کر رہے تھے۔ اس رات سات ستاروں
 کا چمکنا آسمان پر چمکتا رہا اور منتظر را کوہ اُسے نگاہیں اٹھا کر
 دیکھیں لیکن انہوں نے نبات العیش گردوں کی طرف دیکھا
 اور تان کے قدم اس ہرے پھرے جنگل کی طرف اٹھے جو ان کا
 رہنا تھا۔

صبح ہوئی تو وہ ایک قبیلے پر پہنچ چکے تھے۔ یہی کو جب
 انہوں نے اپنا تھکا ہوا سر اٹھایا تو وہ بڑھاپا کی پیریزری
 سے سامان پیش کی۔ سکھ کے اس گھر میں اُس نے پھر انہوں
 والی زندگی گزاری تھی، اور اب اس سے کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنی اصل
 کی طرف لوٹ جائے۔

دو پہر تک گھر کا سارا سیلاب بندہ گیا۔ ماسٹر فیض بخش
 نے وہ سامان دو بیل گاڑوں پر لاد دیا اور یہی اونٹنی سمیت اپنے
 گاؤں کا رخ کیا جو سکھ سے کچھ فاصلے پر تھا اور جہاں دھڑوں کا ایک
 آبائی گھر ان کا منتظر تھا۔ رات گئے وہ گاؤں پہنچے۔ جیسے تیسے
 سامان گھر میں اتارا، یہی وہی کے ہاتھ پر چند روپے رکھے جو کسی
 دوست سے ادھار مانگ کر لائے تھے۔ اُس سے جلد ہی خا کاڈر
 بیٹھنے کا وعدہ کیا اور ساتھ ساتھ ایک بیل گاڑی میں اپنا بیس اور
 لیٹر دھڑ کا واپس سکھ کا رخ کیا۔ دوسری بیل گاڑی والا آہنی کے
 گاؤں کا تھا اور اپنے پیسے لے کر چند دنوں کے لیے وہیں رک
 گیا تھا۔

بیل گاڑی سکھ شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو سورج سونہیل
 پر تھا انہوں نے بیل گاڑی والے کو شیخ عبدالقدوس کے گھر کا پتا
 بتایا اور جب گاڑی ان کے دروازے کے سامنے رک گئی تو ماسٹر

کرتے ہوئے تقریباً ایک بیٹے بعد دئی پہنچے۔ دئی پہنچ کر شیخ
 عبدالقدوس نے محمد سونی والاں کا رخ کیا اور وہاں محنتی پرائیوٹ
 اسکول میں جا کر آئے۔ مولانا حالی کے بیٹے ماسٹر احمد علی خاں اس
 کے روح رواں تھے۔ کئی دن تک شیخ عبدالقدوس ان کے ساتھ
 جانے کہاں کہاں آتے جاتے رہے۔ ماسٹر فیض بخش درگاہ
 نظام الدین اور دوسرے مزاروں پر حاضری دیتے رہے۔ ہر جگہ
 گرہ کیا، ہر مقام پر دست بدعا ہوئے۔ گھر کی بیوی اور نوری
 کی یاد دینے میں رہا جاتی دیتی تھی جو روپے بیوی کے ہاتھ پر رکھ
 کر چلے تھے وہ تو اب ختم ہو چکے ہوں گے، وہ نیک بخت کیا کر
 وہی ہو گی، گورنر خان کیسے ہو رہی ہو گی۔ یہی خیالات انہیں ہر
 وقت بیکار کرتے لیکن دئی پہنچ کر انہیں قدرے اطمینان ہو گیا تھا ان
 کا خیال تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ محنتی پرائیوٹ اسکول میں مذکور
 ہو جائیں گے۔ لیکن جب شیخ صاحب نے وہاں سے بھی رخصت کر
 ماندا تو ماسٹر فیض بخش گھبرا گئے۔

”شیخ سائیں اب کہاں کا ارادہ ہے؟“
 ”ہم کیا اور ہمارا ارادہ کیا۔ اللہ چاہتا ہے سو کرتا ہے۔
 ہماری ایک ایک حرکت اُس کے تابع ہے۔ ہم تو بس چلتے دیکھ
 گئے پھر اشارہ کہاں کا ہو گا وہاں ہمارے چلنے گئے۔“
 ماسٹر فیض بخش نے برس برس کر کے دیکھا دیا۔ انگریزی تعلیم ان کے
 اندر کے صوفی کو ختم نہیں کر سکی تھی اور اب چند مہینوں سے وہ
 جس ایٹلا میں گرفتار تھے اُس نے انہیں تصوف کی طرف کچھ اور
 بھی زیادہ مائل کر دیا تھا۔

اسٹیشن پہنچ کر شیخ صاحب نے ماسٹر فیض بخش کو مختصر
 سے سامان کے پاس کھڑا کیا اور ایک کر جانے کہاں کے دو ٹکٹ
 بنوائے اور اپنی جیب میں رکھ لیے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر لگی تو دونوں
 تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں براجمان ہو گئے۔ ریل علی اور
 چلتی ہی چلی گئی۔ اسٹیشن آتے رہے، ریل رکتی رہی لیکن شیخ
 صاحب نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔ ماسٹر فیض بخش کا دل
 ہر کوس پر ڈو تیار رہا شاید انہوں نے شیخ صاحب کا ساتھ
 پکڑ کر زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ اجنبی ماحول، اجنبی
 لباس، اجنبی زبان، ہر لمحہ وہ اپنے گھر سے اپنا رہنمائی سے
 دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔

گاڑی کھنکھنے کے چار بار اسٹیشن میں داخل ہوئی۔
 ماسٹر فیض بخش نے اسٹیشن کی عمارت کو دیکھا تو دیکھتے

لیے نمودار ہوتے اور ہر کس دور کل جاتے۔ انڈا کا اسٹیشن
 آیا اور پھر گروارے کا شیخ صاحب نے بتایا کہ گروارے ہی
 سے پرانے کانپور کے آثار شروع ہو جاتے ہیں اور یہ بھی کہ
 عوام انسان کا نیور کو، کمپو، کہتے ہیں۔ ریل کیل پر سے گزرنے لگی
 تو ماسٹر فیض بخش نے گنگا کے پاٹ کو دیکھا جو دور دور تک
 پھیلا ہوا تھا اور بہت ہی چوڑا تھا۔

اسٹیشن پر آخر کو شیخ صاحب نے تانگہ لگا کر اور تانگے
 والے کو گوال ٹولی چلنے کو کہا۔ گوال ٹولی میں وہ جن صاحب کے
 ہاں آئے اُن کا نام حمید الدین تھا، وکیل تھے، دیوانی مقدمات
 لڑتے تھے اور شیخ عبدالقدوس کے بہت معتقد تھے۔

شیخ صاحب کو گوال ٹولی میں وکیل صاحب کے ہاں بٹھارے
 اور دوسرے ہی دن سے ماسٹر فیض بخش کو ساتھ لے کر روزانہ حلیم
 بائی اسکول کا چکر لگانے لگے۔ وہاں انہوں نے جاو کی جانے
 کوئی ایسی چیز بھی کھائی کہ کانپور پہنچے کے چھ دن ماسٹر فیض
 بخش ملیں بائی اسکول میں تاریخ اور فارسی پڑھانے پر مقرر ہو گئے
 جس روز تقریباً پچھران ملے شیخ صاحب نے اس روز ماسٹر
 فیض بخش کو تنہا اسکول بھیجا تھا۔ تقریباً کار پر وہ ماسٹر فیض بخش
 کے ہاتھ میں آیا تو پہلے تو انہیں یقین ہی نہ آیا پھر جب یقین آیا تو
 انہوں نے گھر پہنچ کر شیخ عبدالقدوس کے قدم چھو دیے۔
 ”اے اللہ کے ایک بھائی بندے کو مزید گنہگار کیوں کرتے ہو؟“
 شیخ صاحب نے یہ کہتے ہوئے اپنے سپر پیگ سے آثارے
 کھڑاؤں میں ڈالے اور سر پر زرد رنگ کا چارخا نہرو مال لپیٹے ہوئے
 اٹھ کھڑے ہوئے ”ذرا ایک تانگہ تو پکڑنا“

ماسٹر فیض بخش ایک کر تانگہ لائے تو دیکھا کہ شیخ عبدالقدوس
 کاٹین کا بس اور سبز گلی میں رکھا ہے اور وہ اپنا تانگہ تو تنہا بٹھا لے
 ہوئے وکیل صاحب کے گھر سے نکل رہے ہیں۔

”خیریت سائیں؟“ ماسٹر فیض بخش نے گھر کا پوچھا۔
 ”بس اب ہم چلے، اب وہاں آٹھ گیا ہاں سے؟“
 ”لیکن کہاں شیخ سائیں؟“

”یہ، کہاں، کون سا مقام ہے نقشے میں دیکھ کر رکھنا“
 شیخ صاحب نے اپنا ٹین کا بس اٹھاتے ہوئے کہا اور ماسٹر
 فیض بخش نے اس کے ہاتھ سے مقام آیا اور تانگے میں رکھ دیا۔
 ”وکیل صاحب کا انتظار تو کر لیتے سائیں؟“

”فخر صرف موت کا انتظار کرتے ہیں، آدمیوں کا نہیں“
 انہوں نے تانگے کے پائند پر سپر جھپٹا اور بٹھل کر چلے گئے۔
 ان کے پیچھے ہی تانگے والے نے تانگہ بڑھایا، اُن کی آن میں
 تانگہ لگی سے نکل گیا بس گھوڑے کے سموں سے اڑنے والی
 دھول رہ گئی۔

ماسٹر فیض بخش کا دل کسی نے گنجھی میں جکڑ لیا۔ شیخ
 عبدالقدوس تھے تو جیسے گھر ساتھ ساتھ چل رہا تھا اپنی زمین
 پیروں کے نیچے تھی اور اپنا آسمان سر کے اوپر تھا۔ انہیں پچھلی
 سی چڑھنے لگی۔

وکیل صاحب کچھ ہی سے آئے تو ماسٹر فیض بخش نے انہیں
 شیخ صاحب کے جانے کی خبر سنائی، حمید الدین وکیل سر ہار کر گئے
 وہ شاید شیخ صاحب کی اچانک آمد اور اس سے بھی زیادہ فوری
 رخصت کے عادی تھے۔ پھر ماسٹر فیض بخش نے اپنا تقریبی کا
 پروانہ وکیل صاحب کو دکھایا اور عرض کی کہ اگر مستقل رہائش کا بھی
 کوئی نیا دوست ان کے توسط سے ہو جائے تو... وکیل صاحب نے
 یہ سن کر بھی اسی طرح سر ہار جاتے شیخ صاحب کے جانے کی
 خبر پر ہلایا تھا اور خاموشی سے اٹھ کر زنان خانے میں چلے گئے۔

دوسرے روز وکیل صاحب کچھ ہی جاتے ہوئے انہیں بھی
 ساتھ لے گئے۔ دو پہر تک ماسٹر فیض بخش کے لیے پھول
 باغ میں رہائش کا انتظام ہو چکا تھا۔ یہی ایک وکیل صاحب
 کا گھر تھا گھر کے پچھواڑے ایک کمرہ اور بہت اچھا تھا۔

ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں خاکسری رنگ کا ایک لافان کا منظر تھا۔

رہ گئے۔ یہ اسٹیشن کی عمارت کا بے کو سختی راجا کا محل تھا۔ وہ
 پلیٹ فارم پر ٹھیل چل کر عمارت کو مختلف زاویوں سے دیکھتے
 رہے، لوگوں کے مترنم ہجے کو سنتے رہے اور لوگ انہیں
 دیکھتے رہے۔

کھنکھنے سے گاڑی روانہ ہوئی تو شیخ عبدالقدوس نے بتایا
 کہ ان کی منزل کانپور ہے اور وہ اسٹیشنوں لہجہ کانپور آجائے گا۔
 ماسٹر فیض بخش نے کانپور کا نام تاریخ کی کتابوں میں پڑا تھا۔
 یہ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ جنگ انداز کے دوران میں یہ شہر
 نا نا صاحب نے بڑے زبردست معرکے کے بعد فتح کیا تھا۔
 انگریزی قبضے سے چھڑ دیا تھا۔ یہ بھی وہ جانتے تھے کہ وہاں
 اسٹو نیلے کی ٹیکسٹری ہے۔ اس کے آگے ان کی معلومات کا خزانہ
 خالی ہو جاتا تھا۔

وہ کھڑکی سے گردن نکال کر بیٹھ گئے۔ سرسبز منظر ان
 کی نگاہوں کے صحرائوں میں اڑتے ہوئے تھیں کی طرح نظر پھر کے

فیض بخش نے گاڑی سے اتر کر اپنا مختصر سا سامان اتار کر لگی میں
 رکھا، بیل گاڑی والے کو خوشنماں دیا اور جب وہ رخصت ہو گیا تو
 شیخ عبدالقدوس کے گھر کی گڑی ٹھکانائی۔

دروازہ کھلا تو نبیان اور شلوار پہنے ہوئے مسواک کرتے
 ہوئے شیخ عبدالقدوس اُن کے سامنے کھڑے تھے اور سوالیہ
 نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”میں آ گیا ہوں“ ماسٹر فیض بخش نے اپنے سامان کی طرف
 اشارہ کیا۔ شیخ عبدالقدوس نے سر ہلایا اور گھر کا دروازہ کھول دیا۔
 ماسٹر فیض بخش نے اپنا سامان اٹھا کر گھر کے آگے میں رکھا اور خود
 بھی اندر آ گئے۔

اُس روز بعد دو پہر وہ دونوں ریل سے روانہ ہوئے۔ یہ
 ایک ایسا سفر تھا جس کا شاید کوئی انت نہ تھا، کم از کم ماسٹر فیض
 بخش کو تو یہ محسوس ہونے لگا تھا۔ شیخ عبدالقدوس مختلف شہروں میں رکتے
 رکتے، ایسے ایسے جہوں میں ٹہرتے ہوئے، سرواں میں قیام

کہ انگریزوں کے مظالم نے ایک بہت عالم نوجوان کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں اس کے لیے ہم بنائے جا رہے ہیں اور نوجوان انقلاب کے بغیر ہندوستان کی آزادی کا تصور بھی محال ہو گیا ہے۔ وہ کتاب کا کپڑا تھا، انہوں نے اس کے تجلیے میں جہنم مونی موٹی کتا میں بھری ہوئی درجی تھیں۔ جب وہ سوشلزم، مارکسزم اور کمیونزم کے بارے میں بولتا تو آتی بہت سی کتابوں کے حوالے دیتا کرتا تھا اپنے آپ سے شرم آتے تھے۔ وہ عمر میں اس سے بڑے تھے، تاریخ کے استاد تھے لیکن ان نظریوں اور نظریہ سازوں سے ناواقف تھے۔

کانپور میں انہوں نے پانچ سال گزارے لیکن پھر اچانک گھر انہیں اتنی شدت سے یاد آئے کہ وہ خوشی رام اور شعلہ کانپوری کی نالائقی مولے کہ اور اسکول سے انصاف دے کر جیل بڑے۔ گھر آئے تو ہینڈل نوڈی کے سر سے نہ نکلے۔ وہ اب پھر سال کی ہو گئی تھی اور اس کی ایک ایک ادا انہیں گریہ ناک رشتہ تھی۔ پس انداز کرتے ہوئے روپے ختم ہونے لگے تو ایک واقعہ کے ذریعے انہیں جیسا کہ ایک اسکول میں ملازمت مل گئی لیکن دو سال میں ہی وہاں سے بھی ان کا جی بھر گیا۔ سینے کے اندر ایک ہیتر آری سی تھی، کچھ کہنے کی کھٹنے کی، لیکن وہ کیا کہیں کیا نہیں۔ یہ ان کی سمجھ میں آج تک نہ آیا تھا۔

اب وہ کئی برس سے گھر میں تھے۔ سر پر وقت کا بھجوت اتنی تیزی سے جاتا تھا کہ وہ ماسٹر جنس جنس سے سائیں فیض بخش ہو گئے تھے۔ اب ان کی گزراں گاؤں کے پچوں کو قراں پڑھا یا سدا سدا اور درو پڑھا نہ تھی۔ بعض بچے کنگز ریل پڑھتے آتے تھے اور وہ انہیں سی سی ٹی وی، اور آگے کی کڑی، یا کڑی تھے۔ فارسی پڑھنے اب کوئی نہیں آتا تھا اور تاریخ سے بھی کسی کو دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کانپور، سومرہ اور شاہراہ خان کے شعبہ ہائے نسب کتابوں کے مٹھوں میں ملتے تھے اور شہروں میں بھی تک انگریز کی سمدلداری تھی۔

نوری کی ماں اس بے پروا سامان زندگی سے اتنی ہلکان ہوئی کہ جانبر نہ ہو سکی۔ مرنے والے دن بھی جاکر ابیر تھا۔ وہ چلی گئی تو وہ جاتے والوں میں خود تھے، نوری تھی اور عزت۔

اتنے اور لڑائی کی جنگ میں جھلنے لگے۔

شیلے جوتے ان کی نظر ایک چھوٹی سی پٹاری پر پڑی جو پائی کے ایک کونے میں کچی تھی اور چراغ کی روشنی میں اس پر جی ہوئی گرد صاف نظر آتی تھی۔ انہوں نے اسے برسوں سے نہیں کھولا تھا۔ اس میں کتنی پرانی یادیں بند تھیں۔ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس گرد اور پٹاری میں کیسے کیسے نام سورتے ہیں۔ وہ چند لمحوں تک اسے غور سے دیکھتے رہے پھر انہوں نے بیٹوں کے بل کھڑے ہو کر اسے اتار لیا، چونک مار مار کر اس پر جی ہوئی گرد اڑائی اور اسے کھول کر بیٹھ گئے۔

اس میں سکھ پلو، چندر شیکھر آزاد اور درگا دیوی کے چند خط تھے۔ ہنس راج وائٹس، کی ڈائری تھی۔ ہنس راج، وائٹس، جی خوب پڑھتا تھا۔ وہ ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن کا بہت اہم تھا۔ بجلی کے کام میں اسے اتنی مہارت تھی کہ مشکل سے مشکل کام وہ چکی بجاتے گزرتا تھا، تب ہی دوستوں نے اس کے نام کے ساتھ وائٹس کا کانٹا اس سنجیدگی سے کیا تھا کہ وہ ہنس راج کی عرفیت بن کر رہ گیا تھا۔

سائیں فیض بخش اس سے پہلے مرتد کانپور میں ملے تھے۔ ان دنوں وہ کلکتہ، لاہور، امرتسر اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں ہم مارنا پھر رہا تھا۔ وہ کانپور چھوڑ کر راجپوت پڑھنے آئے اس دوران میں انہیں اس کے دو تین خط ملے پھر ایک روز اچانک وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا جیدر آباد چلا آیا۔ ان دنوں وہ ڈسٹرکٹ کی مشین کو بارودی سرنگ سے اڑاتے اور دوسرے لاہور کا سپر ہیسیس میں پولیس کو مطلوب تھا۔ وہ سائیں فیض بخش کے گھر کئی روز مہمان رہا۔ پولیس اس کی تلاش میں سرگردم تھی پھر ان کے منع کرنے کے باوجود وہ وہاں سے چل پڑا۔

جالتے جاتے اس نے اپنی ڈائری اور چند کام پڑوں کے خطوط حفاظت کے خیال سے ان کے پاس رکھوا دیئے تھے۔ وہ کسی مشن پر تھا اور اسے مکمل کر کے دوبارہ ان کے گھر آنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن وہ ڈائری اور خطوط ان کی پٹاری میں آج تک محفوظ تھے۔ ہنس راج ان چیزوں کو لینے نہیں آسکتا تھا۔ ان سے رخصت ہو کر وہ جیدر آباد کے مصافقات میں چلا گیا اور وہاں

ابنی وہ دن بھی ہو گا جب اپنا راج دیکھیں گے جب اپنی ہی زمیں ہوگی اور اپنا آسمان ہوگا

ایک آٹا مل کے کپاؤٹ میں ایک کامیڈ کے گھر ٹھہرا۔ وہ گھر اس کے دشمن، کی تکمیل کیلئے زیادہ مناسب تھا۔ وہاں پہنچے کے دوسرے دن بعد اسے اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ دوپہر کا کھانا کھا کر سو رہا تھا اور اپنے خیال میں نہایت محفوظ مقام پر تھا۔

سائیں فیض بخش کو یہ غیر ملکی قورہ کلیجہ تھا کہ وہ گئے ہنس راج سے انہیں ایک خاص تعلق تھا لیکن وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

انہوں نے اس کی ڈائری کی ورق گردانی کی۔ ایک صفحہ پر ۱۹۳۰ء لکھا ہوا تھا اور اس کو سرور روشنائی سے نشان زد کیا گیا تھا۔ سنہ کے پیریکٹ میں لکھا تھا کہ کامیڈ سین کے دوسرے کے بعد سائیں فیض ہونے والے واقعات،

۱۲-۱ ستمبر کراچی سٹی پولیس اسٹیشن پر ہم چھینکا گیا ۱۲-۲ ستمبر۔ لاہور چند ملنگ، کراچی میں ہم چھینکا گیا اور غیرات لام گرفتار ہوئے لیکن ناگانی شہلوں کی بنیاد پر رہا کئے گئے۔

۳۰ نومبر: کراچی سٹی پولیس اسٹیشن پر ایک بار پھر ہم چھینکا گیا۔

۲۵-۴ نومبر: کراچی کے ایک گھر سے ہم بنائے کا سامان پکڑا گیا۔

۲۸-۵ نومبر: جیدر آباد میں سپر ٹنڈرٹ آف پولیس کے کپاؤٹ پر ہم مارا گیا۔

ان پانچ اندراجات کے بعد کوئی اور واردات لکھی نہیں گئی تھی اور جون ۱۹۳۲ میں ہنس راج خود ہی گرفتار ہو گیا تھا۔ حالانکہ ۱۹۳۱ میں ان لوگوں نے کیا کیا ہو گا؟ سائیں فیض بخش نے سوچا۔ چہرہ خطر کو اٹھاتے بیٹھے لگے ان میں بہت سے خوشی رام کے خط تھے۔ مٹیالے کا فٹول پرنٹل روشنائی قلب سے دھندلا گئی تھی۔ خطوں کے سبب میں زیادہ دنوں تک رہنے اور پتہ نہ ملنے کرنے کے سبب جنوری میں پھیل گئی تھیں۔ لفظ کہیں کہیں سے آڑ لگتے تھے۔

انہوں نے ایک گہری آہ بھری۔ یہ سب اس زمانے کی یادگار ہیں تھیں جب وہ تاریخ پڑھتے پڑھتے چند گھنٹوں یا چند دنوں کے لیے دلوش مسافروں کے میزبان بن جاتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ تاریخ کا دھارا امن، اور شائستگی کی گزراں سے موڑا نہیں جاسکتا اور یہ بھی کہ بادشاہوں اور ظالموں سے لڑنے کے لیے اور اپنا حق چھیننے کے لیے قہر مندوں کی نہیں ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزادی کے پیر غورن سے جھلکتے جاتے تب ہی وہ لکشی کی طرح ہر گھر کے انگن میں جھانپتے بجائی ہوئی آرتی ہے یہ سب کچھ انہیں تاریخ کی کتابوں نے بہت پہلے سکھا دیا تھا۔ لیکن پھر بھی ان کی طبیعت ہم بنانے اور ہم مارنے کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔ عملی طور پر یہ کہہ کر کے کاٹھا۔ انہوں نے اس طرح ادایا تھا کہ انگریزوں کے خلاف کام کرنے والے انقلابیوں کے خط دوسرے آدھے پڑھتے، کبھی کسی مفرد انقلابی کو اپنے گھر نہرتے اور کبھی اپنے تجلیے میں کوئی اخذ فروری (سامان، رکھو کہ اس پر سے دوچار کیا ہیں اور اب علموں کی اپیاں بھر کر شیع آباد سے چین گنج اور بیلٹ نگر سے قول گنج میں جاتے۔

ان خطوں کو لکھنے والوں میں سے اب کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا۔ سب پھانسی لگاؤں سے ہو کر بستی چلا پہن کر سرخ تیلیوں اور آتشیں رنگ جالگوں کی تلاش میں چلے گئے تھے۔ وہ اور ان جیسے دوسرے بے عمل اور بزدل زندہ تھے اور آئندہ جیسے برسوں زندہ رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

انہوں نے نہ کیا ہو ایک کاغذ کھولا۔ یہ سنگی لائین اسکول کا پی کا ایک ورق تھا خط پر ۱۹۳۱ء کی تاریخ تھی۔ یہ خط انہیں خوشی رام نے لکھا تھا اور ساتھ ہی اس میں جھلکتے سنگھ کے آٹری اشتہار بھی نقل کئے تھے۔ انہوں نے دھندلائی ہوئی ان کی آنکھیں لفظوں کا تعاقب کرنے لگیں۔

اسے یہ فکر ہے ہر دم تیار فریضہ کیا ہے ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں تم کی ہتھیار کیا ہے کوئی دم کا ہماں ہوں اسے اہل غفلت چربخ سحر ہوں بھجا چاہتا ہوں یہ شعر جھلکتے سنگھ نے پھانسی لگاؤں میں کہے تھے۔ بستی چلا پہننے سے مروت سولہ دن پہلے۔ ان کے انشوان اشعار پر نشان ہوئے رہے۔

وہ جاتے تھے کہ اگر کسی کو گمان بھی ہو جائے کہ ان کے پاس یہ کاغذات موجود ہیں اور یہ کہ مافی میں ان کا انقلابیوں سے کوئی تعلق بھی رہا ہے تو قید یا مشقت ان کا مقصد ہوگی اور درود کی ٹھوکریں نوری کا۔

کسی نے تیز آواز میں کٹری کھٹکھٹائی۔ ان کا دل ایک لحظے کے لیے تیزی سے دھڑکا۔ اس وقت کوئی آسکتا ہے؟ انہوں نے پٹاری سے نکلے ہوئے کاغذ تیزی سے واپس

اور عزت ہی اس گھر میں آخر تک رہنے والی تھی۔

انہوں نے ایک گھر اس میں باندھ لی اتنی تیزی سے گزر گئی۔ جیسے گزری ہی نہ ہو۔ وہ کچھ دیر تک خالی الذہن بیٹھے رہے پھر انہوں نے مثنوی لکھو تھا دفتر اٹھایا اس کے درمیان سے مود کا پر نکالا اور بے ساختہ اس پر تیر لیا۔ یہ وہ حسن تھا جسے خریدنے کے لیے سکوں کی ضرورت نہیں پڑتی تھی جبکہ زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے تو ٹھکان میں ڈھیلے ہوتے جیسے ہی کام آتے ہیں پیٹ بھر کے لیے، تن ڈھانچے کے لیے، پیروں میں بکھ پینے کے لیے انہیں آتے یا جانے کے لیے۔ انہیں خیال آیا کہ اتنی تیزی جو وہ اپنی یادوں میں گم ہے ہیں تو چراغ کا تیل بے سبب جلا ہے۔ وہ اتنے امیر کہاں تھے کہ چراغ میں جلتے ہوئے تیل کو پختہ میں ہٹانے کے لیے سوچ تو وہ اندھیرے میں بھی سکتے تھے۔

اپنے اس خیال پر پھر وہ خود ہی مشرق مدہ ہو گئے کیا چراغ میں جلتا ہوا تیل، اس سے جھلکتی ہوئی روشنی انداس روشنی میں چلتے ہوئے لفظ نوری کی جھوک سے زیادہ اہم تھے؟ یہ کہ خیال خیال تھا۔ وہ اپنے آپ سے گھر آئے، انہوں نے دفتر بند کیا پھر وہ

اسی میں رکھے، اسے بتکرب اور طاق پر رکھ رہے تھے کہ کھڑکی کی آواز دوبارہ آئی۔ انہیں نوری کی آواز سنائی دی۔ وہ انہیں بکار دہی تھی۔ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے اوطاق سے نکلے، انگلیں سے گزرتے ہوئے دروازے تک گئے اور زنجیر ہٹائی۔

ساتنے ڈھیرہ لٹکے نو کا کاٹھنہ کھڑا تھا۔ سلام اور احوال طلبی کے بعد اس نے بتایا کہ ڈھیرہ سائیں کے کچھ مہمان آئے ہیں اور ڈھیرہ سائیں نے انہیں بلایا ہے۔

”تم چلو۔ میں آتا ہوں“ انہوں نے دروازے کی کھڑکی پر چھائی اور پلٹ گئے۔

”کون تھا بابا؟“ نوری کی آواز میں امید کا لچکا تھا۔ گھٹن کے بعض بچے بابا کے پاس پڑھتے آتے تھے، کچھ نو جوان شاہ کے کلام کی تفسیر اور تفسیر سمجھنے کے لیے آجاتے تھے۔ بھی کبھی انہیں سے کوئی کچھ کہہ دیتا یا میرانی کی طشتری پہنچا جاتا تھا۔ آخر استاد کا حق بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔

”ڈھیرہ سائیں نے بلوایا ہے۔ ان کے مہمان آئے ہیں“ سائیں فیض بخش نے دھبی آواز میں کہا اور نوری کی آواز تیل سے خالی چراغ کی طرح بھٹک کر گھس گئی۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے اوطاق میں آئی، خاموشی سے پبلنگ کے پیچھے سے ان کے جوڑے نکلتے،۔۔۔ صندوق سے ان کی دھندلائے ہوئے رنگوں والی اجڑا کمال کر ان کے ہاتھ میں نکلتی اور باہر چلی گئی۔

سائیں فیض بخش نے اس کی پیٹھ دیکھی تو سیٹے میں خیر خبر لگیا۔ وہ بھی جھکت سگھ اور جس داس کی راہ چلتے تو آج یہ پیٹھ تو انہیں نہ دیکھتی پڑتی۔ جلتے والوں کو جھلایا نظر آتا ہے لیکن اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ تاریخ میں نام بھولنے کا وقت گزر چکا تھا۔ انہوں نے کھسے ہوئے جوڑے میں پیر ڈالے، اجڑا اور سی چراغ اٹھا کر باہر آئے، نوری تھنڈے چہرے کے قریب بے چراغ چھپیں مرنے ہوئے بیٹھی تھی۔

”یہ رکھو، بیٹا“ انہوں نے جلتا ہوا چراغ اس کی طرف بڑھایا۔

”نہیں بابا، اسے بچھا دو۔ ابھی چاند چڑھے گا تو سارے میں چاند ہوجائے گا،“ نوری نے ان کے ہاتھ سے چراغ لیا پھر اس کی ایک پھونک سے چراغ کی کوکھ لیا۔

گھر میں اندھیرا چھ گیا۔

”کھڑکی پر چڑھو،“ ان کی لڑتی ہوئی آواز نے کہا اور پھر وہ سارے گھر سے گھرے باہر نکل گئے۔

گھوٹوں سے گزرتے ہوئے، اکا دکا راہگیروں کے مودبانہ سلام لیتے ہوئے وہ ڈھیرہ سائیں کی چوٹی کے سلمہ پہنچے باہر کئی اونٹ بیٹھے جگای کر رہے تھے اور ڈکرا رہے تھے۔ کارندوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ بڑے احترام سے اندر پہنچائے گئے۔ ڈھیرہ سائیں کے اوطاق میں منتھے جل رہے تھے۔ انگریزی وضع کی کرسیوں پر کئی لوگ بیٹھے تھے۔ اندھیرے کی عادی آنکھیں اتنی بہت سی روشنی سے چندھیا گئیں اور انہیں آنکھوں پر اپنے ہاتھ کی اوٹ کرنی پڑی۔

”اؤ سائیں، آؤ زنجیر سلامت،“ یہ ڈھیرہ سائیں کی کمرادی اور بھری پٹری آواز تھی۔

”خیر سلامت سائیں،“ وہ قریب ترین خالی کرسی پر جلدی سے بیٹھ گئے۔ اب ان کی آنکھیں آہستہ آہستہ روشنی کی عادی ہو رہی تھیں۔ انہوں نے عاجزی و دانکاری سے مسکراتے ہوئے ان لوگوں کی طرف دیکھا جو ڈھیرہ سائیں کے مہمان تھے اور بڑے تکلف سے بیٹھتے تھے۔ ان کی سیاہ آنکھیں اور چوڑی دار پاجامے، سفید برقع شالواریں، مسروں پر مورے پھروں ایسے کلفت لگے جوڑے اور گردن کی چٹن کے ساتھ ساتھ تھرتھرتے ہوئے طرے یہ سب تو بہت دور سے آئے تھے۔

لوگ کیا کہیں گے کہ جسے نقاب کشائی کرنی ہے وہ اتنے پیچھے ہے۔

آنے کی آپ کو علم مندوں اور کاروباری شہروں تک جیلنے کی آڑھی، دکھانار، بالو، کسان، مزدور سب ہی فائدے میں رہیں گے سب کچھ اپنا ہوگا، انگریز اور ہندو دونوں سے چھٹکارا ہو جائیگا۔ سائیں فیض بخش کے دل پر گھوسا لگا۔ انہیں ہندوستان

سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کی میٹنگیں یاد آئیں ان میں شریک ہونے والے یاد آگئے۔ میلے کرے، پڑھی ہوئی ڈاڑھیاں گھسی ہوئی کولہ پوری پچھلیں۔ ان لوگوں کا ان بردار اور شاندار رنگوں سے چھلکا ہوا رنگ کیا جاسکتا تھا لیکن انہوں نے اپنی آنکھوں میں انسانوں کو کبھی مذہب کے خالقوں میں تقسیم نہیں کیا تھا۔ ان میں سے بیشتر بڑے ہندو تھے، سکھ تھے لیکن سائیں فیض بخش نے ان کی زبان کے بھی ایک مرتبہ سنی، ہندو جہانوں کی بہتری، یا سکھ جہانوں کی بہتری کا جملہ نہیں سنا تھا۔

سانس کا پرندہ سائیں فیض بخش کے سینے میں پھر پھڑپھڑانے لگا۔ ”بہتری کی بات تو صحیح ہے صاحب پرندہ مذہب میں کیا رکھا ہے۔ سب اس کو پروانے کی لپلا ہے۔ کیا ہندو کی اسلمان، کیا رام اور کیا رحیم، سب چراغوں میں ایک کی جلی جلتا ہے“ سائیں فیض بخش گونگر ہو گئے۔ ان لوگوں کے کہنے کے مطابق آزادی ملنے والی تھی۔ ان کی نگاہوں میں حق داس، سانیاں، اے گھوس، جھکت سگھ، رام محمد سگھ آزاد اور کامادیوں کے نام اور چہرے گھوم گئے۔ یہ آزادی ہونے والی تھی اس میں کتابت ساندو مسلمان اور سکھوں شامل تھا۔ ”ریل کی پٹری سے ہندوؤں کو تو کوئی نقصان نہیں ہوگا،“ ڈھیرہ سائیں کے بڑے بیٹے نے ذرا بیکل ہو کر پوچھا، اس کے زیادہ تر دوست ہندو تھے۔

”نہیں میاں ان کو کیا نقصان ہوتا؟ وہ بھی نامدے ہی میں رہیں گے یہاں سے جانے میں انہیں آسانی رہے گی۔ ویسے ہم میلے کے دو اندر ساتھ لائے ہیں، وہ ساری اور پنج سمجھتے ہیں، ایک مہمان نے دھیمے لیے میں زبان کے بیٹے کو تسلی دی اور اپنے دوساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”ہر چیز تیار ہے جناب سروے مکمل ہے، نقشے بن چکے ہیں۔ انگریز انٹر بھی راضی ہے، سرکاری روپیہ میری تحویل میں ہے۔ بس آپ لوگوں کی اجازت کی ضرورت ہے،“ میلے کے ایک کافر نے کہا۔ گفتگو کا بوجھ پور شیشا ہوتا گیا۔ سائیں فیض بخش کو وحشت ہونے لگی۔ انہوں نے اس سے بھی زیادہ حوشی بانی سننی تھیں۔ ہم بنانے کی، ہم بنانے کی ریل اڑانے کی لیکن اپنی صلہ طبیعت کے باوجود ان مقصودوں سے انہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی جب کہ یہ لوگ تو ریل کی پٹری پھلانے کی بات کر رہے تھے۔ شاید وہ بڑھے ہونے لگے تھے اسی لیے انہیں نئے لوگوں ہونے ماحول سے اختلاف ہونے لگتا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو سمجھا یا پھر کسی نے بجلی کے تار کھینچنے اور اسکول کھٹنے کا ذکر کیا۔ سائیں فیض بخش کا ڈوہتا ہوا دل تھم گیا جب اپنا اسکول بھڑکا تو اس میں بڑھانے کا اُن سے زیادہ جھلکا اس کا حق ہوگا۔ وہ تاریخ کے کتے اچھے استاد ہیں۔ سندھی توخیزان کی مادی زبان ہے، تاریخی اردو اور انگریزی بھی جانتے ہیں وہ ان سے کہیں گے کہ سائیں آپ بے شک مجھے صرف ایک فنون پڑھانے کی تنخواہ دینا لیکن میں سب کچھ پڑھاؤں گا۔ ایک نئی خواہ میں سب کچھ سمجھ آئے گا کتنی بھی سمجھ رہے گا اور تیل کا پیسا بھی۔ لیکن پھر تیل کے پیسے کی تو ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بجلی آجائے گی اور بجلی ان کے

سائیں فیض بخش سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بڑے شہروں کا شور اور ان کی جہل پہل کہیں بہت دور سے انہیں آواز دینے لگی، برسوں پیچھے سے۔ انہیں ان لوگوں پر رشک آیا۔ ان کے گھروں کو جانے والی سڑکیں پہل تھیں، ان کی عورتوں کو پانی کے لیے سیالوں نہیں چلنا پڑتا تھا، ان کے ہاں قدم قدم پر اسکول کالج اور ہسپتال تھے، انہیں روزگار کے کتنے بہت سے مواقع نصیب تھے اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہاں بجلی آگئی تھی اور ہر وقت بہرہ ور کا نہیں رہتا تھا کہ تیل ختم ہو گیا تو کھاب کیسے بڑھی جائے گی۔

”یہ لوگ ایک جوڑے کے آئے ہیں سائیں،“ ڈھیرہ سائیں نے اپنی آنکھوں میں پچھنی ہوئی آنکھیں سے کیلتے ہوئے کہا اور وہ اپنے خیالوں سے بے چونک گئے۔

”کیسی جوڑے سائیں؟“

”ان لوگوں کا کہنا ہے کہ بہار گاؤں راستے سے بالکل اٹک تھکا ہے۔ پچی ٹرک نہیں ہے۔ کھیتوں کے لیے پانی نہیں ہے سرکاری مشینا نہ ہیں۔ یہ لوگ بڑی دور سے آئے ہیں۔ کتنے ہیں یہاں ریل کی پٹری بھی نہیں گئے تو پھر سب چیزیں یہاں بھی ہو جائیں گی۔ گاؤں کے لوگوں کو روزگار ملے گا۔ مل گئیں گے شغافانہ اور اسکول کھائے گی بجلی آئے گی۔“

سائیں فیض بخش اسکول اور بجلی کے نام پر بھل کر بیٹھ گئے۔ اُن کے ہون کا دھندلائی ہوئی سرخی میں کہیں امید کا جھنک چکے تھے۔ آئے والوں میں بھی ایک ایک کے کہے بولتے گئے۔ اپنی تجویز کے حق میں دلیل دیتے گئے۔

”سائیں آپ آپ کی تاؤ۔ آپ استاد ہو۔ فیملی بھر ملی چرچلے آپ کے علم کا مشورہ دو۔“

”آپ خود سوچیں جناب، خیر ہے کہ انگریز جڑا رہا ہے اور ہم مسلمان کوئی مملکت ملنے والے ہیں۔ یہ لیساندہ علاقوں کو بڑھا دینے کا وقت ہے۔ آپ اپنے ہی علاقے کو میں۔ تعدادیں مسلمان زیادہ ہیں لیکن زور ہندوؤں کا ہے۔ یہاں سے ہندو کو آپ جانا ہوگا۔ ہمارے مسلمان بھائیوں کو ان کا حق ملنا چاہیے، ہم انوں میں سے ایک کف دردمن ہو گئے۔“

”وقت آگیا ہے کہ ہم مل کر اپنے سلطان جہانوں کی بہتری کے لیے صرف معصوم ہی نہیں بنائیں، واقعی کچھ کر گزریں۔ اکیسے اتنی دور سے چل کر ہم یہاں آئے ہیں“ دوسرے کی آواز بھی قافیہ بند تھی۔

”انگریزوں وہ کہہ کر چلا ہے کہ مسلمانوں کی مملکت ان کے اکثریتی علاقوں میں ہے، تو ہم انتھار کیوں کریں، اپنا کام ابھی سے کیوں نہ شروع کریں۔ یہاں ریل کی لائن نہیں ہے جو کسی بھی علاقے کی ترقی کے لیے بنیادی شرط ہے۔ انگریز نے جب ہندوستان پر حکومت کا منصوبہ بنایا تھا تو سب سے پہلے شجارت کو شیان قائم کی تھیں پھر ریل کی پٹری کھائی تھی۔ اس علاقے کا سروے بہت پہلے ہو چکا ہے، پٹری قافیہ قریب تک پہنچ چکی ہے، پھر تو اب اس کا کام رہ گیا ہے۔ دیوے میں کچھ مسلمان اشرافیہ جرات سے ہیں کہ آزادی ملنے تک پٹری کھینچنے کا کام ہو جائے،“ ایک صاحب نے بے برد باری سے تمام صورت حال واضح کی۔

”آپ خود سوچتی سہولت ہو جائے گی۔ سرکاری ملازموں کو

گھر میں تو سب سے پہلے آئے گی۔ وہ استوائیں، علم کی روشنی چھلاتے ہیں۔ ان کے گھر میں اندھیرا تو ممکن ہی نہیں رہے گا۔ دل کے طاق پر امید کے ننھے ننھے دیے جلانے ملازم نے اگر وہ پرہ سائیں کے کان میں سرگوشی کی اس نے سر ملایا، پھر ایک طرف فرش پر دسترخوان بچھنے لگے۔ سائیں فیض بخش پڑا کر اگلے کھڑے ہوئے "اچھا سائیں اجازت اب چلتا ہوں۔"

"ابھی کہاں سائیں فیض بخش۔ بیٹھو بابا بیٹھو۔ ہمارے دسترخوان کو عزت بخشو" وہ پرہ سائیں نے منہں کر کہا۔ "نہیں سائیں، اگھانا تو میں سرشام ہی کھاتا ہوں" سائیں فیض بخش کے مڑھلے ہوئے چہرے پر پھپھکی سی ہنسی پھیلی گئی "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اسے بابا آپ بیٹھو تو وہی آپ کی باتوں میں تونشہ ہے سائیں نشہ ہے، آپ اب ہر گز تو سب کا جی لگا رہے گا وہ پرہ سائیں نے ٹھٹھکانا ہوا ہاتھ لگایا۔ سائیں فیض بخش جانتے تھے کہ یہ درخواست نہیں حکم ہے۔ ان کے کندھے ڈھلک گئے اور وہ بھی دوسرے مہمانوں کے ساتھ فرش پر ڈھے گئے۔

اوقات طرح طرح کے کھانوں کی خوشبو سے بھر گیا۔ بریانی پلہ پھیلی، کھانڈ کی کھیر، آئیرہ، گرم کھانوں سے اٹھتی ہوئی بھاپ، سائیں فیض بخش کی آنکھوں میں مریں بھر گئیں۔ وہ پرہ سائیں اور ان کے مہمانوں کے اصرار کے باوجود وہ مڑھلے خالی پلیٹ پر کڑے ہوئے پھولوں سے کھیلے رہے۔ ایک بے چراغ گھر کی چھوکی جینی کی چھو لدا پلیٹ میں چمن کا ڈبے بیٹھی رہی، ان کی آنکھوں کو دوستی رہی اور اس کا زہر کھانوں کی خوشبو کے ساتھ نتھنوں کے راستے ان کے منہ سے میں، اترتا رہا۔

چند ہی ہفتوں بعد گاؤں بھانت بھانت کے لوگوں سے بھر گیا۔ طرح طرح کی بولیاں بولنے والے مزدور، فولاد کے ٹکڑوں اور پلیٹوں سے بھرے ہوئے ٹرک، انہر سائیں فیض بخش کے گھر کے سامنے والے میدان میں دندناتے رہتے۔ سامان اترتا رہتا، مزدور شور مچاتے رہتے۔ دلی کی پٹری ان

زندگی ناحق، ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی، تصویر بن گئی تھی۔

ان کے گھر سے بس چند ہی گز کے فاصلے سے گزرنے والی تھی۔ قریب ہی ریلوے گاؤں بننے کا منصوبہ بھی تھا۔ ان دنوں سائیں فیض بخش کو کچھ پور بہت یاد آتا تھا۔ ویسا ہی شور، ویسی ہی ٹھک ٹھک، کھٹ کھٹ، مزدوروں کے چالے پانی، سنگریٹ مڑی اور کھانے کے لیے کٹی کھٹے وجود میں آ گئے تھے سائیں فیض بخش بچنے میں ایک دو بار گھر سے نکل کر اس سارے منظر کو دیکھتے آپ ہی آپ سسکتا تھے اور پھر اوقات میں آ کر کوئی کتاب کھول کر پڑھتے تھے۔ ان کی بصارت خوب صورت اشعار اور سماعت ہتھوڑوں کی آوازوں، مزدوروں کے شور و غوغا اور اورور سیروں کے احکامات سے بھر جاتی۔

جلد ہی وہ وقت بھی آ گیا کہ کام ختم ہو گیا اور ریل کی ٹری سچھ گئی، ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن بن گیا۔ اس سے متصل چند گوار تعمیر ہو گئے جنہیں ریلوے گاؤں کا نام دیا گیا تھا ایک بار پھر سائیں فیض بخش کی وہ پرہ اندھ ڈونکی جولی میں ملی ہوئی۔ سائیں فیض بخش وہاں پہنچے تو مہمانوں کے جھوم میں وہ پرہ سائیں ہیزبان بنا بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ آج ریلوے اسٹیشن کے نام کا مرحلہ درپیش ہے۔

سائیں فیض بخش نے ان سب لوگوں کو دیکھا، اچانک وہ لوگ انہیں بہت پیارے لگے۔ کیسے بے غرض تھے یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر یہ بار بار اس ویرانے میں آتے تھے محض اس لیے کہ دوسروں کو کھو نہ دیکھیں، ان کا نامادیا۔ سے جو طمکیں، انہیں شفا خانے، اسکول، بجلی اور پانی فراہم کر سکیں۔ کیسے بے نفس لوگ تھے۔ ان کی آنکھیں کناروں سے چھلکنے لگیں۔

"اتحاد ریلوے اسٹیشن کیسا نام رہے گا؟" سائیں فیض بخش نے کچھ دیر سوچ کر کے بعد بھیجائی ہوئی آواز میں پوچھا اور وہ پرہ سائیں کو کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ پرہ سائیں نے زندگی میں ایک ہی توفیق سیکھا تھا کہ باہر لوگوں کی ہر واہ کے نیچے اپنی واہ کا ایسا بھی لنگے جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو زندگی خوب بھر سی پڑی گزرے گی۔

اس روز سارے گاؤں میں میلے کا سماں تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ انگریز کا یا نا اور دلی کا پہلی مرتبہ آتا دونوں خوشیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ اسٹیشن کے ساتھ ہی گڑھے کھود کر چلے بنائے گئے تھے۔ ان پر ساندی کی طرح چھجائی ہوئی دیکھیں چوھی ہوئی تھیں، ان کے نیچے کٹڑیوں کے کھٹے سنگ رہے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے شامیانہ لگ چکے تھے۔ شامیانہ اور پلیٹ فارم کا فنڈ کی رنگین بھینڈیوں سے سجایا گیا تھا۔

سائیں فیض بخش نے اس روز نہا کر اپنا سب سے اچھا جوتا پہنا، بیوی کے زمانے کی موٹر کی شیخی سن کر کال ہوا ایک چوتھائی بھری ہوئی تھی۔ اس میں سے بہت احتیاط سے انگشت شہادت کی پور پر چند قطرے نکال کر سینے پر ملے، ہر دور میں جو تہنیں کر گھر سے نکلے اور اسٹیشن کی طرف چلے۔ گھر سے نکلتے ہوئے انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ٹوری نے پلنگ گھسیٹ کر ان کی دیوار سے لگا دی ہے اور اس پر کھڑی ہو کر اس رونق کا انتظار کر رہی ہے۔ اس نے بابا کی زبانی دھواں اڑائی چھک چھک کر کر دلی کا ذہن بہت سنا تھا لیکن دلی کو بھی دیکھنا تھا اب اس



کی زندگی میں پہلا تجربہ پڑ رہا ہے وہ والا تھا کہ وہ کہا نیوں کی ریل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے سائیں فیض بخش کو ہرے حیرت خیز ہوتے ہوئے وہ پرہ سائیں کا کارندہ اب تک انہیں بلانے کیوں نہیں آیا ہے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا، وہ راستے میں کہیں رہ گیا ہو گا، اتنے بہت سے کام ہیں، کسی انتظار میں آئے دیر ہو گئی ہوگی۔ ریلوے اسٹیشن کا نام انہوں نے رکھا تھا، وہ پرہ سائیں اور اس کے مہمان ان کی بہت عزت کرتے تھے، کہتے تھے کہ منہج بھر میں ان ایسا عالم و فاضل کوئی نہیں ظاہر ہے وہ لوگ اسٹیشن کے نام والی شخص کی نقاب کشائی بھی انہیں سے کرانے لگے۔

وہ عطر سے بھینکتے ہوئے اسٹیشن پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ نام کی تختی پر سبز لٹیکہ کا نقاب ہوا ہے اسے اڑ رہا ہے اور نیچے سے نستعلیق میں لکھا ہوا نام جھلکیاں مار رہا ہے۔ ہر طرف کھو سے کھوپل رہا تھا۔ ان لوگوں کے جھوم کے درمیان وہ پرہ سائیں کی جھلک نظر آئی۔ وہ بھیڑ کے درمیان سے راہ بناتے ہوئے وہ پرہ سائیں تک جا پہنچے۔ وہ پرہ سائیں نے انہیں

دیکھا۔ اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیا اور پھر اس طرف متوجہ ہو گیا جس طرف سے ریل کی کوئی ہوئی آواز بھی آئی تھی۔ سب لوگ جھک جھک کر اشتیاق سے دن کی روشنی میں پیارے کی طرح محبتی ہوئی پٹری کو اور اس پر پہنچتے ہی کرتی دھواں اڑائی، تیزی سے اپنی طرف اڑتی پہلی آتی دلی کو دیکھ رہے تھے پلیٹ فارم اس کی آمد سے رزرتے لگا پھر ہر یکوں کی آواز آئی اور وہ تھکتے تھکتے سروں پر آہنچی۔

ریل کے رکتے ہی وہ پرہ اللہ لاؤ فرسٹ کلاس کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ سائیں فیض بخش اس کے پیچھے پیچھے تھے فرسٹ کلاس کے ڈبے سے مور کے پروں ایسے پروں والے اور سبھا اچنوں والے آتے۔ سائیں فیض بخش نے آگے بڑھ کر مہمانوں سے ملنا چاہا لیکن وہ پرہ سائیں کے کارندہ آتے والوں کے گلوں کی کلاب کے ہار پہنانے میں مصروف تھے مہمانوں کی گل پوچی کرنے والے کارندوں کے ریلے نے انہیں قدر سے پیچھے دھکیل دیا۔ انہوں نے وہ پرہ سائیں کو فرسٹ کلاس سے نکلنے والے ایک انگریز کی طرف لپکتے دیکھا لیکن پھر فوراً ہی انہیں اندازہ ہوا کہ باہر آتے والا انگریز نہیں، انگریز ہی بس پہنچے ہوئے ہے۔ وہ پرہ سائیں نے آگے بڑھ کر اس کے قدم لیے۔ آئے اپنے ہاتھوں سے کلاب کا سب سے موٹا اور قدموں کو چھو تا ہوا ہار پہنا یا پھر سب لوگ اس تختی کی طرف چلے جیں کی نقاب کشائی ہوئی تھی۔

سائیں فیض بخش نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ یہ نہ ہو کہ مہمانوں کے سامنے وہ پرہ سائیں کی سبکی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے کہ جسے نقاب کشائی کرتی ہے وہ اس قدر پیچھے ہے۔ لوگوں کو ہلٹاتے ہوئے وہ جب سختی تک پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ انگریز کی لباس والے شخص کی انگلیاں سبز رنگی نقاب کی دوڑی کو بے نیچہ رہی ہیں۔ سائیں فیض بخش کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا خط نستعلیق میں لکھا ہوا اور ان کا رکھا ہوا نام، اتحاد، دھوپ میں پلکیں چھپکا تے لگے۔ اسٹیشن تالیوں سے گونج اٹھا تو ان کے ہاتھ بھی میکانیکی انداز میں مالی بجائے گئے لیکن ایک سوئی سی ان کے سینے میں ٹوٹ گئی۔ یہ نام تو میں نے دکھا تھا۔ حق تو میرا تھا، پھر آگئی کہ اندر سے دوسری آواز آئی۔ لیکن نہیں اتحاد، کام طلب ہی ہے یہ تو اسے سب کی محبت سب کی شفقت سب کی ہوتی ہے۔ انہوں نے ناپ چاہا کہ کچھ بھیجا پھر بے اختیار گھوم کر گھر کی سمت دیکھا۔ نوکی کا چہرہ دیوار پر لٹکا ہوا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر نکالا پھر لیں۔

پہلی ٹرین سے آتے والوں کا سامان پلیٹ فارم پر ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ چلنے کی گلیوں میں رہی تھی۔ ڈبوں سے دوسرے اور دوسرے درجے میں سفر کرنے والے لوگ دل سے اتر چکے تھے۔ کچھ دیر دیر دیکھ کر کے ڈھکن اتار دیے گئے۔ گراماں سان اور مصالحہ دار چادروں کی خوشبو ہر طرف پھیل گئی سائیں فیض بخش کی سوچی ہوئی آنتوں تک یہ خوشبو پہنچی تو وہ تیز تیز قدم اٹھا کر پلیٹ فارم سے اتر کر اپنے گھر کی طرف چلتے چلے گئے۔

چند ہی ہفتوں میں زمین و آسمان بدل گئے، لوائی گئے ہمتانی گئے۔ سداہو کی تہ میں سوئی ہوئی پڑھوں کی لاکہ رہ گئی۔ اڈاؤنوں کے بجائے ہوئے سیاہ گئے، عاقلوں کے لنگے ہوئے پیڑہ گئے۔ انسان چلے گئے۔ اشیاء رہ گئیں۔ ریل مچتی رہی۔ پڑا تے جاتے رہے، نئے آتے رہے۔ خون کی بڑ سے جھپکی ہوئی اور زنا کی غلامی سے لٹھری ہوئی جنرین آتی رہی۔

سائیں فیض بخش دونوں کی طرح نگلیں میں پھرتے رہے اب تو سچل کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ شاید وہ بھی چلا گیا، پڑھوں کا، ان کے

بول چکا تھا کوئی دھرم ہو سکتا ہے، وہ توبہ کے سہارے ہیں، آواز دہلا کر
کا پر سادہ باندھے پھرتے ہیں۔ دل میرے مومن دوست کا دھیرا،
سائیں کا دھیرا، بیچ بیچے گنگا، بیچ بیچے دھلے گنگا میں اب لاشیں
بہتی تھیں اور زندہ رہنے والوں کی آنکھوں سے دھلے۔
مہینوں وہ اسی طرح بولا بولے رہے۔ کبھی کسی بیکر کے
نیچے بیٹھ کر دل کی پٹری کو تھکے اور تھکے تیل کی کچی لے کر شام کو دیران
مندر کی طرف نکل جاتے۔ ہوتی کرتے ہوئے مندر میں دھنواں
اور دیا بولور تیاں انہیں تنہائی سے خوف کھاتی ہوئی اور اپنے
پجاریوں کی دوسراہت کا دان مانجی ہوئی نظر آتیں۔ وہ اداسی
سے ان مورتیوں کو دیکھتے تھے ڈھونڈ پر رکھے ہوئے دیے میں
تیل کی کچی سے چند قطرے تیل پکاتے، دیا روشن کرتے، تھوڑی
دیر وہاں بیٹھے رہتے۔ کبھی دیرانی سے گھبراہٹ ہوئی تو فرسوز
آواز میں شاہ کی کوئی وائی یا مولانا تاروم کے اشعار گنگناتے
لگتے۔

آوی وید دست باقی دوست است،
دیدان باشد کہ دید دوست است
خشک تار و خشک چوب و خشک پوست
از کبھی آید ایں آواز دوست

خوشی رام، میرے سو بہترے سائیں، میرے ٹھوڑے
سائیں، پھر سے تان اڑاؤ، سب ٹھٹھ پڑا رہا ہے گا
جیب لاد چلے گا بجا رہے خوشی رام کی آواز کا پرندہ ان کے وجود
میں اپنے پر مارنے لگتا، اس کی آواز اپنے بیکہ کھولنے لگتی۔
اللہ ساڈا ساڈا۔ میں آپس کبھی کبھی بستیوں سے انسان ہوں
چلے گئے تھے، ان میں حیران کہاں سے آنے لگے تھے؟
دات کا رنگ زہر کھائے ہوئے بدن کی طرح آؤ اور ہونے
لگتا تو گھٹے ہوئے قافلے کے میر کا وہاں کی مانند وہ گھر کھاتے۔

سال گزرا تو گاؤں کا علیہ بھی بدل گیا۔ کھلے ہوئے میدانوں
میں نئے نئے گھر مڑے ہوئے تھے، ان کا وزن پڑھاں دن میں
بھونے بیٹھے ہی کوئی خریدار نہ تھا اب وہاں کا بھوک کی بل پڑیں
تھی۔ نئے آنے والوں نے نت نئے سامان کی بچا ہوئی دکانیں
کھول لی تھیں۔ گلیوں میں لوگ زیادہ ہو گئے۔ اور چلنے کا رستہ
تھوڑا سا دانیس بائیں سے کانوں میں ہر وقت انجمنی پولیاں آنے
لگی تھیں۔ سائیں فیض بخش کبھی کبھی اشد ضرورت سے
گھر سے نکلتے تو گاؤں انہیں اپنا گاؤں نہ لگتا بیوں محسوس
ہوتا جیسے راستہ بھول کر وہ کہیں اور چلے گئے ہوں۔

شفا خانے کی عمارت تعمیر ہو چکی تھی، اور اس کا افتتاح
بھی ہو گیا تھا۔ ایک بار نوری وہاں سے طیرا کا کچھ اور دوسرے
در کی گولیاں بچھائے آئی تھی۔

اسکول کی عمارت بن چکی تھی اور چند مہینوں میں
اسکول کھلنے والا تھا۔ ان کی بہت تو نہیں پڑتی تھی لیکن
نوری کے بار بار کہنے پر انہوں نے سوچا کہ انہیں اب دھیرہ
سائیں کے پاس جانا چاہیے اور ان کی خدمات پیش کرنا چاہیے۔
یہ فیصلہ کرنے کے بعد ایک دن انہوں نے نہار گایوں
میں تیل والا صاف جوڑا پہنا اور اڑھی میں کنگھی کی نوری سے
ٹانگ کر آنکھوں میں سر لگا دیا اور دھیرہ سائیں کی جلی جلی جلی
پہنے۔ جلی اب غامی بدل گئی تھی۔ نئی دھن کا سامان آگیا
تھا اور دھیرہ سائیں کی شان میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔
اطلاق میں پہنچ کر انہوں نے دھیرہ سائیں سے بات شروع کی اور
انہیں اطمینان دلانا چاہا کہ کبھی ہی تنخواہ میں تین چار سات دوں
کی جگہ منتھال لیں گے تو دھیرہ سائیں نے دریاں ہی سے ان
کی بات کاٹ دی۔ انہیں یہ سن کر چکر اڑ گیا کہ ستادوں کی تعیناتی
تو بہت پہلے ہو چکی ہے اور چند ہی دنوں میں ریل بن اسٹروں

کو لے کر آنے والی ہے۔

"لیکن سائیں اس کی کیا ضرورت تھی۔ میں جو موجود ہوں۔
اب آپ دوسروں کو اتنی دور سے زحمت دینگے؟" سائیں
فیض بخش کے لیے کی لاچارائی آنکھوں سے گوندھی گئی تھی۔

"ہاں سائیں، وہ تو آپ صحیح کہتے ہو لیکن آپ اب آرام
کرو۔ بوڑھے ہو گئے ہو آپ۔ یہ نئے لوگ ہیں۔ جوان ہیں سائیں
آپ تو بوں بھی رہنا نہیں چاہتے ہو۔" الہ الاہ کیا کرو "دھیرہ سائیں
نے ریڈیو کے لٹوکے کھاتے ہوئے کہا۔ نئے وزیر اعظم کی تقریر
آنے والی تھی۔

سائیں فیض بخش اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے تو ہونٹوں
سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ انہوں نے نوری کے لیے کیسے
کیسے خواب دیکھے تھے۔ ملازمت مل جائے گی تو اس کے لیے
کچھ دان ویزینج کرں گے، ہاتھ پیلے کر دیں گے اس کے۔ اچھے
کھاتے اور ڈھنگ کے کپڑوں کو ترس گئی ہے وہ، دو چار چوڑے
بنائیں گے جوڑیاں خریدیں گے اس کے لیے، دو بچی والی سنہری
چیل انہوں نے ایک دکان پر دیکھی تھی۔ اس پر سو روپے ۵۱ آنے
فیسٹ بھیجی ہوئی تھی۔ سنہری ہی رنگ میں، وہ خریدیں گے
اس کے لیے۔

اب وہ کس مٹے اس کے پاس جائیں۔ کیسے کہیں کر
دل نئے استادوں کو، نئے خون کو کہیں اور سے لے کر آئی
ہے۔

اس روز جب شام ہوئی اور نور کا چار گھر لے کر آئی تو انہوں
نے چراغ بھونک مار کر کھینچا دیا۔ آج سرگودھ رہا ہے بیٹا چراغ
کو آج بچھا ہی رہے دو، وہ۔ دل ہوا ہے چراغ مقلنس کا۔ کی
تفسیر بنے ہوئے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ چراغ کی روشنی
میں نور کی ان کے چہرے پر کبھی ہوئی ہے تفسیر پڑھے۔

قلا دوسے ڈھلی ہوئی پٹریوں نے جس ہزار داستان سفر
کا آکاڑا کیا تھا۔ وہ طے ہوتا رہا۔ لوگ، اتحاد دیوے اسٹیشن
پر اترتے رہے۔ گلوں میں بھٹکتے ہوئے چہروں پر چڑھی ہوئی
دیکھوں کے کھاتے کھاتے رہے اور کھلے ہوئے میدانوں میں چھائیائیں

لفظ شائوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی بجائے فضا میں اڑتے ہوئے پکھر لگتے ہیں۔

دوستانِ حسدی، میں اب ان کا جی نہیں لگتا تھا کبھی کوئی کتاب
کھول لی، موسیقی ماری ہوئی آنکھوں نے دھندلے دھندلے سے
چند لفظ چن لیے اور بس، ذہن محو رائے فکر کی طرح بیا سٹھا
اور اس پر اشعار کی تفسیر کے بادل اب بھولے بیٹھے ہی رہتے
تھے۔

اب جب کہ ان کا جانا صبح اور شام کی بات مگر کبھی تھی، انہیں
کا پیور والے انقلابی دوست بہت یاد آنے لگے تھے۔ شاید وہی
صحیح کہتے تھے کہ کانگریس ہو یا مسلم لیگ دونوں انگریزوں سے اقتدار
حاصل کر کے مطلق ہو جائیں گے لیکن اس سے عوام کی زندگی میں
کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ سماج وادی سماج کا قیام چاہتے تھے
وہ کہتے تھے کہ جب تک بھیتوں میں بیچ بکھرنا ہو گا اسکاں اور
کارخانوں میں شیون کو حرکت دیتا ہو گا اور مزدور بیدار نہیں ہو گا۔
اور اقتدار کو اپنے ساتھ مٹھ میں نہیں لے گا، تب تک بھیتوں میں بیچ
بکھیرنا ہو گا اسکاں اور کارخانوں میں شیون کو حرکت دیتا ہو گا اور
بیدار نہیں ہو گا اور اقتدار کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے گا، تب تک
انسانوں کی تقدیر نہیں بدلے گی۔

انسانوں کی تقدیر نہیں بدلی تھی، ان کی اپنی تقدیر نہیں

آباد ہو گئیں اور دل برباد ہو گئے۔

آنے والوں اور آباد ہونے والوں میں یوں تو بہت سے
تھے لیکن ایک میٹھا شیر وانی والے بھی تھے جن کا نام تو جانے
کیا تھا۔ لیکن وہ اپنے تخلص 'مہجور' سے پکارا رہے اور بیچا لے جاتے
تھے۔ بڑے ڈاک خانے کے باہر بکڑی کا ایک خستہ مال ٹھکان لے
کر بیٹھے تھے اور دوسرے شہروں کو ہر مہینے مٹی آؤر زرخیز لے والوں
کے قدامت پھرتے تھے یا ان کے بولے ہوئے خط لکھتے اور روزی
کھاتے تھے۔

آہستہ آہستہ جانے کی طرح سائیں فیض بخش اور مہجور
صاحب میں شتاسائی اور دستار کا ایک رشتہ استوار ہو گیا۔
دونوں زندگی کی تیز اور آگے بڑھتی ہوئی نوسے سے کھڑے ہوئے لوگ
تھے۔ گھٹنوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہتے اور سماجی کی داک
گرمی سے رہتے۔ مہجور صاحب مشاعرے پڑھتے کبھی کبھی مرثیہ کا پیور
لکھتے تھے، جب انہیں معلوم ہو کہ سائیں فیض بخش کی بیوی سرس
کا پیور رہ چکے ہیں تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔ اب وہ دونوں
اکثر کا پیور کا ذکر کرتے۔ کبھی سائیں فیض بخش نے کا پیور
کے حوالے سے کامیاب دوستوں کا ذکر بھی کیا تو مہجور صاحب
ان مشاعروں کا قصہ لے بیٹھے جو انہوں نے لکھے تھے۔ ان
مشاعروں میں پڑھی جاتے والی طرحی غزلیں، ان غزلوں کو لکھ کر
دینے والے استادوں کی آپس کی جھگڑیں اور اسی طرح کی داستانیں
چند کوششوں کے بعد سائیں فیض بخش کی پھر بہت نہ پڑی کہ وہ
محبت کنگھ جتن داس یا اسے گھوٹ کا ذکر کرتے۔ مہجور صاحب
بہت اچھے انسان تھے۔ اسی لیے ان سے ایک تعلق خاطر
تھا سو رہا۔

نوری کوتار پکن د ہلہ نہ رہی نری۔ وقت کا چہرہ اس
اس کے بالوں میں کپاس کا تھاپا۔ پھر وہ ایک دن موت کے
اندھی کافی تحریلیں دینے کے لیے میلی گئی۔ سائیں فیض بخش
کے لیے زمانہ ختم کیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب وہ کس
کے لیے جنیں۔ کھانا پینا سوتا جاتا تھا۔ سب ان کے لیے جی
ہو گیا تھا۔ شاہ جو رسا لو، مثنوی مولانا تاروم، اور گلستان

چھلتے رہے۔ اب لوگوں کے آنے پر کسی کا اختیار نہیں رہا تھا۔
دھیرہ سائیں کا بھی نہیں۔ زندگی ناقص ہو چھوڑ دی بہت ہے
مختاری کی، تصویر بن گئی تھی۔

گاؤں پہلے تقب بنا پھر شریں بدل گیا۔ نئے آنے والے
اپنے ساتھ بے شمار مسائل لائے تھے۔ ان میں سے کچھ بھرتیں
پرائی ہوئی اور کچھ جوتوں کا ناپین وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا
ہی گیا۔ آنے والوں نے کھیت کھلیاں خریدیں، دکانیں مکان خریدے
پھر کچھ کرنل جنرل تھے جنہیں ان کی خدمت کے عوض عرق بخواہی
نہیں دی گئی، انہیں بھی مفت دی گئیں۔ پھر وہ ہر طرف پھیلے
چلے گئے۔ پرانے لوگ سمجھتے گئے، کچھ بھلتے گئے۔ انہیں
ملازمتوں کے بدلے کی ادھونٹوں کے نہ ہونے کی وہی پرائی
شکایتیں رہیں۔ سائیں فیض بخش فضا میں پھیلے ہوئے ستاروں کا بہت
آہستہ محسوس کرنے لگے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب
کیا ہو رہا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ شکاریس مٹیوں میں بدل رہے تھے
کہ روڑیں ابھرنے لگی ہیں، پشٹونوں کے گھر دیکھ لیا ہے اور پھر انہوں
نے یہ بھی دیکھا کہ فرقوں نے شاعر دل پر آشیاں بنالیا۔ زمینیں

نعرہ کی آواز بہت قریب آگئی تھی۔ سامنے سے ایک بس نمودار ہوئی

کوادر میں بولتا ہوا بحث کرتا ہوا، سیاہ گتھی کمان ایسی
چھوڑوں کے نیچے جادو دیکھاتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں والا جوان
گنگنے لگا۔ ہمیں یہ شوق سے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے۔
انہوں نے اشارہ کر کے گوشہ کی لیکن انکھوں پر ٹیکیں
پانی کی چادر کچھ لگی اور ٹائپ کی باریک عبارت اُس
چادر میں ڈوب گئی۔

”جام بیٹا اسے پڑھو۔ مجھے سننا“
محمد جام نے ان کی بھرائی ہوئی آواز سے تو قدر سے حیرت
سے انہیں دیکھا کچھ کتاب کے صفحے کو۔ یہ ایک گیت نامک
تھا۔ ”جھلکتی سٹک، جندرشیکہ آواز، کسوری لال سکھ دیو
ڈاکٹر گیارہ ساد اور راج گرواس کے کردار تھے، مقام لاہور
سنٹرل جیل کا چھائی گھنٹہ تھا۔

محمد جام کی آواز نے سکھ دیو کا ہاں دہرایا پھر وہ جھلکتی سٹک
کے مکالمے ادا کرنے لگا۔

جھٹ پٹ جو بھانسی دا جھٹکا
سجین دیندا بندے دا منکا!
مڑ لاش ہوا وچ جھلدی اے
تے ایں دھرتی نو جھلدی اے
کچھ صدیاں لئی جھو نچال جیویں
ایہ اپنی موت سوال جویں
ایک بھاری اور گہرے آواز اس شکست گھر کے در دیوار
میں گونجنے لگی اور سائیں فیض بخش جن کی آنکھوں سے
نوری کی موت پر ایک آنسو نہیں گرا تھا، دھڑلے مارنے لگے
گلو گئے آواز میں جام نے کہا۔

تاریخ دے دے وح اوہ دھڑک رہے
کچھ بل بچھ کے مڑ جھڑک رہے
جو اپنی اک جلا ندے نیے
دھوناں دے پھندہ لگانے میں
سائیں فیض بخش نے بے قرار ہو کر اپنی پیشانی سے
پلنگ کی بیٹی پر رکھ کر دسی جب سب آگ جلا رہے
تھے، جب سب آگ میں جل رہے تھے تو میں کیوں
اینا دامن بچاؤں گھڑا تھا خوشی لام مجھے کھسپت کیوں
ہمیں لیا تو تے۔ میرے سوچنے ساکن۔

رات جب تمام دن کا اور زندگی بھر کے پھٹاؤں
کا زہر کی کر سیاہ پڑ گئی اور خشکی ان کی بوڑھی پٹریوں میں گرا جانے
لگی، تب بھی ان کی نگاہوں کے سامنے پینتھ برس کی تاریخ
مختلف جھانکیاں دکھاتی رہی۔ اُس رات انہیں بار بار اپنی
پٹاری کا خیال آجاس میں واپس نہ آئے والوں کی امانتیں
تھیں۔ انہوں نے سوچا، کل محمد جام آئے گا تو یہ پٹاری میں
اُس کے سپرد کروں گا۔ امانتیں اصل وارثوں کے ہاتھ میں
پہنچنی چاہیں۔

محمد جام نے دوسرے دن آیا اور تیسرے دن پونچھے
دن ہجور صاحب اپنی پھڑی ٹپکتے ہوئے آئے۔ انہوں نے
بتایا کہ علاقے کے کئی لوگ کے داشت گردی کے الزام میں گرفتار
ہو گئے ہیں اور ان میں سے ایک محمد جام بھی ہے۔

سائیں فیض بخش کی سمجھ میں نہ آیا کہ جانے والے آنے
کا وعدہ کر کے آئے کیوں نہیں۔ محمد جام کی ذات نے ماضی سے
ان کا رشتہ عجیب طرح جوڑ دیا تھا اور ان کے سینے میں بلو سیوا
کی لاکھ کے نیچے دبی ہوئی ایک چنگاری سلگادی تھی، وہ اس
کی شخصیت کے ساتھ جھنے کی بجائے جھڑک اٹھی۔ لوگ لڑھکائے
آزادی کی آرزو کرنے کی سزائیں کب تک کل کو ٹھہریوں میں
زندگی تیر کر رہے رہیں گے۔ یہ سوال ان کے ذہن میں پھن بھلا

محمد جام دوسرے ہی دن سے اُن کے پاس آئے گا۔ وہ
اُن کی ہدایت کے مطابق، آمد نامہ، اور پاکستان، لے کر آیا
تھا۔ یہ محمد جام عجیب سست مولا تھا۔ عموماً وہ سپریم کو آتا
کبھی ان کے لیے گڑی روٹی لاتا، کبھی حیرہ دھو کر ایلے پوٹے
اندھے۔ اکثر چھوٹے گروہ ان اور پدم کے کوصاف کو دیتا
کبھی صابن کی بیٹی لے آتا اور ان کے میبلے کیڑے دھو کر ڈال جاتا
اس کی نفل میں ہر وقت کتابیں اور رسالے دے دیتے۔ کسی
دن درگاہ ٹریڈی، اور روسن ہسٹری، پر کتابیں ہوتیں
اور کسی دن مارکس اور اینگلز کے پشتیا رے۔

اُسے دیکھ کر اور اس کی کتابیں دیکھ کر انہیں بے اختیار کانپوں
کے دن اور راتیں یاد آ جاتیں۔ بیڑی پہنے کا وہی انداز، پٹریوں
کا وہی بے ڈھنگا پن، بیڑی میں اسی طرح کی گتھی ہوئی چپیں
اور مزاج کی وہی درستی۔ اُن دنوں سندھی میں کتابیں دھڑ
دھڑ کر رہی ہو رہی تھیں۔ ایک روز انہوں نے اس کے پاس ناول
”سداہارت“ دیکھا۔ یہ کسی جرمن کے ناول کا ترجمہ تھا۔ بہت
سرے بعد ان کا دل چاہا کہ اس ناول کو پڑھیں لیکن آنکھوں
نے اب بڑی حد تک ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ لفظ شاخوں پر
بیٹھے ہوئے برتنوں کی بجائے فقائیں اڑتے ہوئے
پکھیروں کی تھکتے آواز گناہوں کی پیل میں نہیں آتے تھے۔

محمد جام نے چند ہی ہفتوں میں پاکستان اور بوسٹان
دونوں ختم کر لیں۔ اب وہ اُسے ملا جامی کی یوسف زلیخا
پڑھا رہے تھے۔ اُسے پڑھانے میں انہیں لطف آنے لگا
تھا اور عرصہ دراز کے بعد ان کی اندر زندگی کی دمشق بیدار
ہو گئی تھی۔

”اب تو یاد آتی تھی محنت سے فاری کیوں پڑھ رہے ہیں؟
ایک روز وہ اچانک اس سے پوچھ بیٹھے۔
”سائیں آپ سے کیا چاہتا ہوں۔ ہمارے پاس ایلان سے کچھ
رسالے آتے ہیں، کتابچے آتے ہیں، وہ سب فارسی میں
ہوتے ہیں۔ اُن کا ترجمہ ہمیں درکار ہوتا ہے۔ باہر کے کسی آدمی
سے ہم یہ کام کر نہیں سکتے اسی لیے میری ڈیوٹی لگائی گئی ہے
کہ فارسی پڑھوں۔“
سائیں فیض بخش کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ محمد جام کی نہیں
سکھ دیو پر ہنسنا کی آواز ہے۔ وہی جملے وہی راڈ داری، وہی
ہی صورت حال۔

”تم کیونٹ ہو؟“ اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
محمد جام ان کا سوال سن کر مسکراتے لگا۔ اور کیا آپ کامر
نہیں ہیں؟“ اس نے جواباً ایک سوال داغ دیا اور وہ برسوں
بعد بے اختیار ہنس دیئے۔ اُس روز کے بعد ان دونوں کے درمیان
اس موضوع پر پھر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ شاید اس کی کوئی ضرورت
نہیں تھی۔

ایک دن انہیں اس کی کتابوں میں ایک پنجابی کتاب نظر
آئی۔ وہ کتاب اٹھا کر اپنی آنکھوں کے قریب لے گئے اور نظروں
کے عنوان سے پڑھنے لگے جو کہ سبلی خط میں تھے۔ ورق اٹھتے
ہوئے ایک عنوان نے ان کی نگاہیں کواٹھے تھکنے میں کس لیا
نظم کا عنوان تھا۔ ”جھلکتی سٹک، جندرشیکہ آواز، کسوری لال سکھ دیو
ڈاکٹر گیارہ ساد اور راج گرواس کے کردار تھے، مقام لاہور
سنٹرل جیل کا چھائی گھنٹہ تھا۔“
”اُد کی باڑہ آئے گی۔ برسوں سے بندھے ہوئے بندوٹوں نے
لگے۔ کانپوں کی لیاں زندہ ہو گئیں۔ ریلوے کالونی کے ایک

بدلی تھی۔ وہ اپنی نقد پر پر اب شاکر ہو چکے تھے اور تمام آرزوئیں
ان کے وجود سے جھٹکتی تھیں۔ وہ خواب جوان کے دوستوں
نے انہیں کانپوں میں دکھائے تھے وہ لمحوں کے بیڑوں پر بیٹھ کر
اتنی دور نکل گئے تھے کہ تصور کے جال میں بھی نہیں آتے تھے۔ ایک
دوسرا خواب تھا جو ڈیڑھ سائیں کے اوقات میں آنے والے تھا
نے دکھایا تھا، وہ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ بڑھ ہوا تھا۔
اب خواہشوں سے حقیقتوں کا وصال نہیں ہوتا تھا اور زمانے کے
یہاں میں خواب قرار نہیں پاتے تھے۔ آنکھوں میں نہیں رہتی
کا مشورہ نہیں اترتا تھا اور دل تیر کے پنجوں سے گھڑی ہوئی زمین
ہو گیا تھا۔

انہی دنوں ایک سہ ماہی گھر کی گڈی لکھی۔ انہیں
حیرت ہوئی، ان کے گھر کا دروازہ اب دن رات کھلا رہتا تھا۔
گھر میں لگایا تھا جسے محفوظ رکھنے کے لیے لکڑی لگا دی جاتی۔ پھر
کون تھا جو کھدے ہوئے شکستہ دروازے پر دستک دے
رہتا تھا؟

”کون ہے؟“ انہوں نے برآمدے میں بڑی ہوئی جھلکتی
چارپائی سے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔
”آپ سے ملنے آیا ہوں“ یہ کوئی انہی آواز تھی۔ نوجوان
اور موڈ۔

”آجائو اند آجاؤ“ انھوں نے جالا کھائی آنکھوں سے آنے
والے کو پہچانے کی کوشش کی۔

”میرا نام محمد جام بیکل ہے“ آنے والے نوجوان نے
ان کے ہر چہرے، مصاحفہ کر کے ہاتھ سینے پر رکھا اور ادب
سے پلنگ کی پانسی پر ٹپک گیا۔
انہوں نے اپنی بوڑھی پٹریوں کو اور جگہ جگہ سے جھولتی
ہوئی کھال کو سبوتا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ”مجھے فقیر کے پاس
کیوں آئے ہو بیٹا؟“

”فارسی پڑھنے آیا ہوں آپ سے“ نوجوان نے
سادگی سے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”اس زمانے میں فارسی پڑھ کر کیا کر گئے؟ ہمارے
زمانے ہی میں فارسی پڑھنے والے سے کہا جاتا تھا کہ پڑھو
فارسی، بیجو تیل۔ پڑھتی ہے تو عمری پڑھو۔ سنا ہے عربی
جانتے والوں کو ہزاروں روپے ملتے ہیں عرب میں، سائیں
فیض بخش نے اداسی سے، ہزاروں، کا لفظ دایا اور زندگی
میں پہلی بار حقیقت ان پر وحی کی طرح آگزی کہ انہوں نے
اپنی پوری زندگی میں کبھی پانچ سو روپے بھی اکٹھے ہاتھ میں
نہیں تھا سہی۔

”آپ درست کہتے ہیں سائیں عربی اب تاروں کے
خزانے کی جگہ ہو گئی ہے لیکن مجھے تو فارسی پڑھنی ہے۔ اپنی
شاگردی میں لے لیں آپ مجھے“ اُس نے اُن کے پیروں کو
ہاتھ لگایا۔

”نہ بیٹا،“ مجھے گناہ مت کرو،“ انہوں نے جلدی سے
پیر کھینچ لیے۔ ”تم کو کیا کرو میرے پاس۔ میں جلدی جلدی آؤ
چند ہی سائیں رہ گئی ہیں ستے میں۔ جو کچھ میرے پاس ہے
لے جاؤ پھر تو سب کچھ مٹی میں مل جائے گا،“ انہوں نے اپنی
آنکھوں کے گوشوں میں جمع ہو جانے والے آنسو پور میں لیے
اور پلنگ کی پٹیا سے پونچھ دیے

انہیں دستار ہا ادران کے اوطاق کی زنگ اور صلاح دار کھڑکی کے طاق میں لکھی ہوئی مثنوی یوسف و زلیخا کے ورق پھیر پھرتے رہے۔

چند دن انہوں نے خاموشی سے سوچتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے گزار دیئے پھر اچانک وہ گلیوں میں نکلنے لگے۔ ان کی ہان پھان کے لوگ خال خال ملتے تھے لیکن انہیں لوگوں کی اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو اس پاس کی فقہا کو محسوس کرنے کے لیے نکلتے تھے۔ کبھی وہ ڈانخانے چلے جاتے اور اس کی بیڑھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے مجبور صاحب کے پاس ٹنگ جاتے۔ کبھی وہ اس گھنٹہ گھر کے سامنے جا بیٹھتے جو آٹھ برس پہلے بننا تھا اور جس کے گھر والی کی آواز دور دور تک سنی جاتی تھی۔

وہ گھنٹہ گھر کے سامنے بیٹھے ہوئے اپنی مندی آنکھوں سے سیاہ سوئیوں کو رو من بند سوں پر حرکت کرتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ وقت کی دیک بک بڑے انہماک سے ہر چیز کو لکھا رہی تھی لیکن کسی کو بھی کھائی ہوئی چیز کا ختم ہو جانا نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں سلیمان بادشاہ کی یاد آتی جو پہلے بنواتے ہوئے مر گیا تھا اور جس کی ٹھوڑی عصا پر برسوں ٹھکی رہی تھی، اس کی رعیت اس کے خوف سے پہلے کی تعمیر میں مصروف نہ تھی پھر دیکھ کر جب اس کی عصا کے آخری دبڑے کو بھی لکھا تھا تب سلیمان بادشاہ کی لاش منکے بل زمین پر آ رہی تھی اور لوگوں نے اپنے سر پر خاک ڈالی تھی کہ جس حکمران کی بیعت و جہورت سے وہ اتنے دنوں دہشت کھاتے رہے ہیں وہ لوگ اب کیساں ہو چکا تھا۔

گھنٹہ گھر کی سوئیوں حرکت کر رہی تھیں، عصا سلیمانی کو وقت کی دیک چاٹ رہی تھی اور فضا ایک نامعلوم تناؤ سے بھری جا رہی تھی۔ اب وہ گھر سے نکلتے تو انہیں سرنگوں پر سے چھوٹے چھوٹے جالوس گزرتے ہوئے نظر آتے۔ انہیں گزرے ہوئے زمانے یاد آتے کیسی جراثیم تھی ان میں اور آج کے دنوں میں۔ ان کے خیال میں یہ مماثلت محض ظاہری تھی تاہم خط مستقیم میں سفر نہیں کرتی وہ وقت کے ہمالیہ پر گروہ پہاڑوں کی طرح دائرے بنا تی ہوئی اور ہر طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ شاید اسی لیے بعض لوگوں کو گمان گزرتا ہے کہ تاریخ دائروں میں سفر کرتے ہوئے اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے، سو نکھ اور سمجھ رہے تھے کہ بات کچھ اور آگے بڑھ گئی ہے تاہم کاکھوتا ہوا راستہ کچھ اور طے ہو گیا ہے۔

جس بڑھتا گیا، اعتماد گھٹتا گیا۔ ان دنوں سائیں فیض بخش کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ کئی دن سے شہر میں نہیں نکلے تھے۔ ایک روز وہ اپنی چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے تو مجبور صاحب خبر لائے کہ عوام کو... منظر پسندوں اور تحریک کاروں کی کارروائیوں سے محفوظ دینے کے لیے ریل سے فوجی دستے بھیجے گئے ہیں اور انہوں نے اسٹیشن کے ساتھ چھوڑ دیں گا دی ہیں۔

سائیں فیض بخش نے گھر کے دلوں سے پر کھڑے ہو کر دیکھا تو دور میدان میں چھوڑ دیوں کی ایک سستی بالکل نظر آئی اور ان کی آنکھوں میں برسوں پہلے کا وہ منظر گھوم گیا جب اسی میدان میں شامیانے لگے تھے، دیکھیں کھلی تھیں، رنگین جھنڈیوں سے ماحول ست رنگا ہو گیا تھا اور آنے والوں کے استقبال کے لیے سارا علاقہ آمڈ آیا تھا۔ اس روز میرناؤں نے سوچا بھی نہ تھا کہ..... نہیں انہوں نے تو کچھ بھی سوچا تھا، اچھا ہی سوچا تھا۔

کئی دن گزر گئے، سائیں فیض بخش کی طبیعت نہیں سنبھل رہی تھی۔ مجبور صاحب روزانہ ان کے پاس آتے، کبھی

دلہ، کبھی کچھ سی کے کمر آتے۔ انہیں بیٹھ کر کھلاتے۔ ان کا دل بہلانے کے لیے باتیں کرتے لیکن ان دنوں سائیں فیض بخش کا دل بالوں سے نہیں بہلتا تھا۔

ایک دوپہر جب مجبور صاحب ساگودانے کا پیالہ لے کر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سائیں فیض بخش صاف ستھرا جوتا پہنے بیٹھے ہیں اور ان کے کپڑوں سے خوشبو آ رہی ہے۔

”آج تو فیض بھائی تمہاری طبیعت بہت اچھی لگ رہی ہے انہوں نے ٹوپی سے اتار کر پلنگ کے پاس لے کر پہنائی پھڑکی کو پلنگ پر لٹاتے ہوئے کہا اور دوبارہ پتلی بیٹھ گئے۔

”ہاں بابا، آج طبیعت بھی چنگی ہے۔ دل چاہا آج نہاں، سو نہاں کیا۔ پکڑے بدل لیے۔“ سائیں فیض بخش مسکرائے۔

”بھیا آج تو عطر بھی لگا یا ہے تم نے۔ بڑی پسین آ رہی ہیں“

”آج پیاری میں کچھ دھونڈا تھا تو تمہاری حرم بھیا بھی کی فحاشی اس کی عطر کی شیشی مل گئی۔ میں تو جوں ہی گیا تھا اسے پیاری کی تہ میں رکھ کر۔ ایک سی بو نہرہ گئی تھی اس میں، میں وہی سینے پر مل لی ہے۔ پرانے زمانے کی چیز ہے، اس لیے ایک بوند کی اتنی خوشبو ہے۔ آج کی چیزوں میں یہ بات کہاں، سائیں فیض بخش نے ایک لمحہ بھری۔

”ہاں فیض بھائی، درست کہتے ہو۔ پرانی بات تو گزرے ہوئے زمانوں کے ساتھ چلتی گئی ہے مجبور صاحب آئندہ ہو گئے۔“ آؤ سائیں۔ ذرا بازار گھوم آئیں،“ سائیں فیض بخش نے ساگودانے کا پیالہ ختم کرتے ہوئے کہا۔

”اس حکیم ٹنگ دھوپ میں کہاں جاؤ گے۔ ہفتوں سے تو پلنگ پر پڑے ہو۔ ایسا وقت بازار چلنے کی کیا ٹنگ ہے۔ کچھ خریدنا ہے کیا؟“ مجبور صاحب نے آگے میں پھیلی ہوئی دھوپ کو دیکھ کر کہا۔

”کیوں مذاق کرتے ہو بابا، ہم بھلا کیا خریدیں گے۔ بس جی چاہ رہا ہے گھر سے نکلنے کا“ سائیں فیض بخش کے بچے میں اتنا اصرار تھا کہ مجبور صاحب نے پلنگ کے پاس سے ٹوپی اٹھا کر سر پر جما لی اور گھر میں پر بوہ ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں باہر آئے جہاں قدم چلے تھے کہ فضا انہوں سے گوجھتی تھی اور اس کے ساتھ ہی چھوڑ دیوں کی بستی بھی جاگ گئی خالی وردی والوں کی چال سے زمین دھکنے لگی۔ ان کے دوڑتے ہوئے وجود پر بڑے بڑے ٹوکوں میں سامنے گئے۔

”سو اصدی پہلے دلی کو خالی وردی والوں نے لوٹ لیا تھا۔ اب ویسی ہی پوشش والے یہاں کیوں آ رہے ہیں اللہ اپنا رحم کرے،“ مجبور صاحب نے اس منظر کو دیکھ کر شوخی کے ٹوٹے ہوئے من سے انجھن لگے۔ ان کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ان کا بھی ایک بیٹا کا بیٹا میں

پڑھتا تھا، ہر وقت زندہ باہر مردہ بادی باتیں کرتا تھا اور انہیں معاملات سے کٹ کر زندگی گزارنے کے طعنے دیتا تھا۔ وہ اس کی باتوں سے بہت سمجھتے تھے۔

سائیں فیض بخش نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکائے چلتے رہے۔ ان کے پاس اب کسی سوال کا کوئی جواب نہیں رہا تھا۔ گزرتے ہوئے ان کی نظر اسٹیشن کے تام کی تختی پر پڑی۔ انہوں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ تختی بہت سیلی ہو گئی ہے اور تختیوں میں کھے ہوئے نام کو کھرج کسی نے خط لکھ میں اسٹیشن کا نام دیا ہے۔

نہروں کی آواز اب بہت قریب آگئی تھی۔ سامنے سے

ایک بس نمودار ہوئی۔ بس پر موٹے موٹے حروف میں یونیورسٹی کا نام لکھا ہوا تھا۔ لوگوں کے سر پر گلیوں سے نکلے ہوئے تھے بعض آدھے دھڑ سے باہر ٹنگ رہے تھے کچھ جھپٹ پر چڑھے بیٹھے تھے اور خالی وردی والوں کو ٹنگے دکھا رہے تھے، حلق

سچاڑ کر ان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ان کی بس ریلوے کراسنگ کی طرف بڑھتی تھی اس کا پیچھا لکھا ہوا تھا۔ بس ابھی وہاں تک پہنچی تھی کہ ایک جیب بس کو اور ٹنگ کرتی ہوئی آگے نکلی۔ اس میں سے ایک اشکر کو دھڑا کر اور بھاگتا ہوا پیچھا لگا۔ اس نے پیچھا لگنے والے کو پیچھا لگا بند کرنے کا حکم دیا اور سچاٹ آہستہ آہستہ بند ہو گیا۔ بس رک گئی، کچھ لڑکے کھڑے نکلتے ہوئے بس سے نیچے اتارے گئے۔ سائیں فیض بخش کا دل پسلیوں کے پیچھے میں مقناری سے پر مارنے لگا۔ وہ تیز تر قدموں سے بس کی طرف بڑھے۔

”فیض بھائی کیا کرتے ہو۔ آگے مت جاؤ، رک جاؤ،“ مجبور صاحب نے ایک کراس سائیں فیض بخش کی آستین تھام لی جسے انہوں نے ایک جھلک سے چھڑا لیا اور آگے بڑھتے گئے مجبور صاحب گھبراتے ہوئے ان کے پیچھے تھے۔ سائیں فیض بخش نے اور مجبور صاحب نے نہیں دیکھا تھا کہ ٹوکوں سے اترنے والے اپنے افسر کے حکم پر شستہ باندھ چکے ہیں۔ ان دونوں نے تو بس، ٹار، کی آواز سنی، جیسے جلیا نوالہ بلغ میں جزل ڈاڑھی آواز لوگوں نے سنی ہوگی۔

فضا رانقلوں کی باڈھ سے گوجھتی تھی۔ بس کے پتروں سے نئی ہوئی بس میں جھپٹ ہوئی اور اس میں سے ہرے ہونے لڑکے خون اگلنے لگے۔ جو لڑکے نیچے اتر چکے تھے وہ پیٹ کا دم کی طرف بھاگے تو گولیاں انہیں چن چن کر فکا کر رہی تھیں۔

طیش سائیں فیض بخش کے بدن میں آتش فشاں کے لاوے کی طرح پھٹ پڑا۔ وہ پلٹ کر پلٹ فارم کی طرف دوڑے۔ ان کی سونگی ہوئی اور کاپٹی ہوئی ٹانگوں نے جانے کس طرح پیٹت فارم کی اونچائی کو پھیلا لگا۔ یہ کیسا اندھا تھا۔ انہوں نے ناقابل یقین حیرت سے ان خالی وردی والوں کو دیکھا یہ کیسے لوگ تھے؟ ایک جھکے سنگ بھی تو تھا۔ اس نے سب کے لیے جان کی تھی اور یہ اپوں ہی کی جان لینے کے لیے آئے تھے۔ ایک گولی بولے۔ اسٹیشن کے تام کی تختی پر ٹنگی اور انکا د کے الف، کو کھینچ لی گئی۔ باپتے ہوئے اور بھاگتے ہوئے سائیں فیض بخش نے رہ جانے والے اتحاد کو دیکھا اور ان کے منطقی ذہن نے اس لمحے بھی رنجیدگی کی اس عبارت کو یاد کیا جس کے مطابق اتحاد کے معنی ایک دوسرے سے ناراض ہونے اور یا ہم غضبناک ہونے کے ہیں۔

مجبور صاحب پیٹت فارم کے نیچے کھڑے ہوئے انہیں آواز میں دے رہے تھے، واپس بلارہے تھے لیکن سائیں فیض بخش کے کانوں میں ایک جھوٹے میسرے گیت کی گوجھتی تھی یہ گیت آوازوں کا لحن تھا میرا رنگ دے بسنی چولا،

انہیں ایسی گلی کا ایک خوبان نظر آیا جو نشانے کی زمیں آچکا تھا۔ وہ اسے بچانے کے لیے بڑھے لیکن ان کے پیچھے سے چلے ہی وہ زمین پر گر گیا تھا اور اس کے سینے پر لائے کے پھول کھل رہے تھے۔ انہوں نے اس کا حلقہا ہو سارے زانو پر رکھا۔ اسی لمحے ایک دیکھا ہوا انکارہ ان کے بدن میں جھلکا ان کی گردن جھکی جیٹی۔ ممدتی ہوئی آنکھوں نے پلوں کا کبھی نہ اٹھنے والا پردہ گرنے سے پہلے دیکھ لیا کہ آخری بوند کی خوشبو سے جھٹکا ہوا ان کا چولا بسنی ہو گیا ہے اور وہ اس ایمان کی سلاسی کے ساتھ رخصت ہوئے کہ دیکھ عملے سلیمان کو کھینچا ہے اور بادشاہ کا لیے جان بدن زمین پر گر گئے ہی والا ہے۔



شہید وطن اشفاق اللہ خان



ہندوستان کی تاریخ آزادی میں شہید وطن اشفاق اللہ خان کا نام نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے، مادر وطن کی آزادی اور ناموس کے لئے انہوں نے برطانوی سامراج سے ٹکری اور تختہ دار پر پہنچ کر حیات دوام کے مالک بنے۔

شہید اشفاق اللہ خان شاہجہاں پور کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے، باقی اور کرکٹ کے بہترین کھلاڑی اور بہترین شہسوار، نشان باز اور شاعر تھے، جذبہ حریت سے سرشار ہو کر ام شہید کھلکے سنگھ کے ساتھ تنگ آزادی میں شریک ہو گئے اور عظمت وطن کے نئے گائے ہوئے پھانسی کے پھندے کو زیب کھو کر لیا۔ شہید اشفاق اللہ خان کا لکھا ہوا زیر نظر گیت برطانوی حکومت سے ضبط کر لیا تھا، لیکن آزادی کے دیوانوں کی آوازیں اس کے بول ملک کے طول و عرض میں گونجتے رہے۔

کس لی ہے کمراب تو، کچھ کر کے دکھائیں گے
آزاد ہی ہو لیں گے، یا سر کو کٹا دیں گے
بٹلنے کے نہیں پیچھے، ڈر کر کبھی ظلموں سے
تم باتھ اٹھاؤ گے ہم پیسے بڑھادیں گے
پروا نہیں کچھ دم کی غم کی نہیں ماسم کی
ہے جان پھیلی پر ایک پل میں گواہیں گے
اٹ تکتی زباں سے ہم ہرگز نہ نکالیں گے
تلوار اٹھاؤ تم ہم سر کو جھکادیں گے
سیکھا ہے نیا، ہم نے لڑنے کا طریقہ یہ
تم گولیاں چلو، ہم سینہ اڑا دیں گے
دلو، ہمیں پھانسی، اعلاں یہ ہمارا ہے
ہم نوں سے شہیدوں کے ایک فوج بنادیں گے

اے رفیق محترم

(مزدور رہنما ڈاکٹر اسرار زبیر کے نام مشہور انقلابی شاعر حسن حیدری مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ نظم)

جبر کے نیروں کی نو میں روشنی کی ہر برق
تیرگی کے ہر گس پر خونِ انساں کی اشق
چاک داماں کا فیہ نہ زندگی ہر ورق
خون میں ڈوبا ہو اسے آرزو کا ہر افق
عشق کا سینہ ہے شق اور حسن کا چہرہ ہے فاق
یہ شباب چہرہ دہتی یہ بہار شام غم
اے رفیق محترم
مقتلوں کے یہ پجاری، تلوں کے یہ حبیب
یہ خموشی کے شت خواں، یہ تنگ کے رقیب
انکا مسک خون گلشن، ان کا مذہب ہے صلیب
تو محبت کی علامت، یہ تشدد کے نقیب
تو محبت کا اجالا، تو بہاروں کا علم
اے رفیق محترم

اے رفیق محترم
تجھ پہ کیا گزری ہے مجلس میں کسی کو کیا خبر
کس طرح لکھی گئی ہے داستانِ سنگ و سر
جسم پر چپاں ہیں کتنے فلم کے مسل و گہر
کتنے کوڑے پڑ چکے تاریخ کے اوراق پر
یہ ہے مقتل کا اجالا، یہ ہے زنداں کی سحر
خون کس کس کا پیسے گی یہ نہیں بدشت غم
اے رفیق محترم
شب گزیدوں کو تری آواز بھونکا پیسے
قید خانوں سے ہی آواز جرس آتی رہے
زندگی پابندیوں میں رقصِ فساداتی رہے
لب پہ ہر شب ہیں تو ہنسی گاتی رہے
دشتِ قاتل پہ زخموں کو تھی آتی رہے
کب تک زندہ رہیں گے خالقِ مصائب تم
اے رفیق محترم
اے رفیق محترم

ورقیسری دنیا

شاید لطیف

کی نشریات سن چکے ہوتے ہی وجہ ہے کہ حکومت برطانوی ایجنسیوں کی تجدید کو اتنی ہی اہمیت دے رہی ہے۔ اچھی آئرن صاف اور کیفیٹی نے خلائی پروگرام کو مدد کی تھی۔

امریکی حکومت نے پورے ٹرانسپیریٹ کی تجدید اور نئے
ٹرانسپیریٹوں کے قیام کے منصوبوں پر سرگرمی سے عمل درآمد -
شروع کر دیا ہے تاکہ دنیا بھر میں وہ اس آف امریکہ کے سامعین
کی تعداد میں اضافہ ہو سکے۔ امریکی اتحاد و شہر کے مطابق
اس وقت دنیا میں وہ اس آف امریکہ کے سامعین کی تعداد ساڑھے
ہے۔ افریقہ و ایشیا کے براعظموں میں اس کے سامعین کی تعداد
میں مزید اضافہ کیے امریکہ سری لنکا میں ایک بہت بڑا
ریڈیو سٹیشن تعمیر کر رہا ہے۔ اس ریڈیو اسٹیشن سے ایشیا و افریقہ
کی تقریباً ۵۰ زبانوں میں پروگرام نشر کیے جائیں گے علاوہ انیس
وہ اس آف امریکہ کے لیے بوشوانہ، مھندوس، امرائیل مارش
اور تھائی لینڈ میں تے ریڈیو اسٹیشن بھی قائم کیے جا رہے
ہیں۔

ریٹیلو کے علاوہ امریکی ٹی وی نشریات کو گروہ ارضی کے
طول عرض میں پھیلانے کے منصوبے پر بھی عمل ہو رہا ہے
اس مقصد کے حصول کے لیے "ورلڈ نیٹ" کے نام سے ٹی وی
نیٹ ورک کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ریٹیلو کے ذریعے
نشر ہونے والی "ورلڈ نیٹ"، کمی ٹی وی نشریات کا واسطہ پہلے
ہی ایشیا و افریقہ کے کئی ممالک تک پھیل چکا ہے۔

سہی آئی اسے شاید دنیا کا سب سے بڑا حکومتی ادارہ ہے
 جس کا مقصد امریکی پریس پر ایجنڈے کے اور حریف ممالک کے متعلق
 غلط افواہوں کا ترقی پذیر ممالک کے عوام کے ذہنوں پر مسلط کرنا ہے
 اس مقصد کے حصول کے لیے بے پناہ وسائل بروئے کار لاتے ہیں
 رہے ہیں۔ نیویارک انٹرنیٹ ٹیوشٹ آف ماس میڈیا کے ڈائریکٹر
 ولیم شارب نے امریکی کانگریس کے سامنے انکشاف کیا تھا۔
 کہ سہی آئی اسے کی بجٹ کا ایک تہائی حصہ غیر ملکی پریس ایجنڈے
 پر صرف کیا جاتا رہا ہے۔ اور دنیا میں سہی آئی اسے سے منسلک
 نامہ نگاروں کی تعداد ایسوسی ایٹڈ پریس۔ یو پی آئی اور رائٹر
 کے نامہ نگاروں کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے۔ پلٹرز و انعام
 پانے والے مشہور امریکی صحافی کے ایجنسیج ”شکاگو ٹریبون“
 کے نامہ نگار کی حیثیت سے مختلف ایشیائی ممالک میں صحافتی
 کام کا تیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ غیر
 ملک میں حملہ والا دنیا امریکی صحافی آگرسٹی آئی اسے کے ساتھ منسلک
 نہیں ہے تو وہ کچھ عرصے تک اپنے ذرائع کو پی سربراہ میں رکھ
 سکتا۔ اور سہی آئی اسے کے ساتھ روابط کا مطلب ہے کہ صحافی

مرکز میوں کو باہم مربوط بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مذکورہ
 ایجنسی کے کارکنوں کی تعداد میں اضافے سے اور اس سے متعلقہ
 سرسبز سیکٹر کے ترقی پذیر افادیت کو بڑھانے کا ماحول بھی کیا
 گیا ہے۔ اور بین الاقوامی سیاست کے میدان میں امریکی طرز عمل
 کی منصوبہ بندی کرتے وقت اس سیکٹر کی تحقیق کو استعمال کیا
 جائے گا۔

امریکی پیرس کے مطابق امریکی حکومت خارجہ پالیسی کیلئے
کے اداروں پر اس وقت ۵ ارب ڈالر سالانہ خرچ کر رہی ہے۔
ادرموت یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن ایجنسی (روایں کوئی اسے)
کا بھٹ ایک ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے اور ۱۹۹۹ تک اس
میں مزید ایک کروڑ ۲۸ لاکھ ڈالر کا اضافہ کیا جائے گا۔ اور اس
انجمناس تاخیر، نے دعویٰ کیا ہے کہ روایں کوئی اسے کے بھٹ۔

جس رات امریکی طیارے لیبیا کے عوام کا قتل
کر رہے تھے، صرف اسی رات "وائس آف
امریکہ" نے پندرہ مرتبہ لیبیا کے عوام کے ہا پیل
نشر کی کہ وہ معمر قذافی کا تختہ الٹ دیں۔

میں اٹھانے کی رفتار پیشاگون (وزارت دفاع) کے بجٹ کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز ہے۔

کانگریس کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ڈی ایس آئی اے کے ڈائریکٹر چارلس وک نے کہا تھا کہ ہم غیر ملکی پریلیمنڈ کے کو بین الاقوامی تعلقات میں اس لیے اتنی اہمیت دے رہے ہیں، تاکہ امریکی معیاروں کے ہائے میں ترقی پذیر ممالک کے عوام کے سوالات کے جواب دے سکیں اور نظریات کی موجودہ جنگ میں یو ایس آئی اے امریکی فزٹ لائن کی مانند ہے۔ اور اس ایجنسی کا بنیادی مقصد ہے آزاد دنیا میں امریکی کے قائدانہ رول کو یقینی بنانا ہے۔

یہ وائس آئی اے کے لیے مختص لہجہ کا بڑا حصہ ہے۔ وائس آف امریکہ کی تجدید اولد اس کے نشریاتی اوقات میں اختلاف پر غور کیا جائے گا اس عشرے کے اختتام تک اس مقصد کے لیے ایک ارب ۵۰ کروڑ ڈالر خرچ کیے جائیں گے۔ وائس آف امریکہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خود امریکی صدر لیگن نے کہا تھا کہ اگر وائس آف امریکہ کتنی سالوں تک عدم توجہ کا شکار نہ ہوئی تو آج دنیا میں لاکھوں مزید لوگ اس

موجودہ دور کی پیچیدہ بین الاقوامی صورت حال میں نفسیاتی طریقہ جنگ یا پراپیگنڈہ ہم بہت زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بڑی طاقتیں اپنے اپنے نقطہ نظر کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بہت بڑے وسائل صرف کر رہی ہیں۔ بین الاقوامی سیاست میں "نفسیاتی جنگ" کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ امریکی حکومت نے سرکاری طور پر یہ اعلان کیا ہے کہ "مشرقی دھاتی میں «نفسیاتی جنگ» امریکی خارجہ پالیسی کا ایک اہم جزو ہو گی۔ اور اس مقصد کے لیے واشنگٹن کی زیر سرپرستی پراپیگنڈہ اور خبر رسائی کا ایسا عالمی نظام قائم کیا جا رہا ہے جس کے ذریعے امریکی انتظامیہ کے نقطہ نظر کو لوگوں کے طول و عرض میں پھیلایا جائے گا۔ اس نظام کے قیام سے ترقی پذیر ممالک کے عوام کی «دیرینہ واشنگٹن کا سلسلہ مزید تیز ہو جائے گا۔

تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے متعلق سامراجی
حکمت عملی کی وضاحت کرتے ہوئے یسٹن ٹیوٹورسٹی کے
پروفیسر ول آرٹن نے لکھا ہے کہ نوآزاد ممالک کے سابق آقاؤں
کی ان ملکوں کی آزادی کے بعد بھی یہی کوشش رہی ہے کہ ان
میں عنان اختیار ایسے رہنماؤں کے ہاتھ میں ہو جو عالمی سرمایہ
دارانہ نظام کے خلاف نہ ہوں یا پھر کم سے کم غیر جانبدار رہیں
اور اپنے ممالک کو کمیونسٹ بلاک سے دور رکھیں۔

یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس کی مدد سے ہم امریکی انتظامیہ اور اس کے مغربی حلیوں کو ان کوششوں کی وجہ معلوم کر سکتے ہیں جو وہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کے ذہنوں پر مغربی معیار کے نظر ہمت کی تہ میں ثبت کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے عینوں براۓ غلطوں پر مبنی سب سے بگڑنے کے باقاعدہ ایجاہ شروع ہو چکی ہے۔ اس پر براۓ بگڑنے کے اثرات کو خاطر میں نہ لانا نہایت بڑی غلطی ہوگی۔ کیونکہ نوآزاد ترقی پذیر ممالک کی سیاسی و سماجی زندگی پر اس سب سے بگڑنے کے اثرات کافی دور رس ہو سکتے ہیں۔

امریکی نظریات کے ترجمان

امریکی حکومت اپنی خارجہ پالیسی اور ذرائع الجلائ کے
مابین تفریق پیدا کر کے اس تصور کو پیش کرنے کی کوششیں کر
رہی ہے۔ پبلک ڈپلومیسی کے لیے مخصوص صدر کی کمیشن
نے بھی اپنی سفارشات میں اس بات پر زور دیا ہے۔ کہ
سرکاری پراپیگنڈہ سروس۔ یو۔ این۔ ایف۔ سی۔ ایف۔ ایس۔
ایس۔ کے لیے اسے اور دفتر خارجہ سے متعلق اداروں کی

پریس کو کسی آئی اسے کی گھڑی ہوئی معلومات فراہم کی جائیں۔ اور پھر کے مطابق کسی آئی اسے صحافیوں کو یہ ہدایت بھی جاری کرتی ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں کس واقعے کو چھال جائے اور کس کو دبایا جائے۔

افریقا اور ایشیا کے بہت سے ممالک میں پریس کی آزادی پشیمانیوں میں کام کرنے والے اکثر نامہ نگاروں کا تعلق بھی کسی آئی اسے سے ہوتا ہے امریکی اخبار "واشنگٹن پوسٹ" کی خبر کے مطابق ان کا بنیادی فریضہ دوسری اقوام خاص طور پر

اخبار وال سٹریٹ جرنل، "الیشیا کے لیے خاص ایڈیشن۔ شائع ہوتا ہے۔ ہفت روزہ "ٹائمز" کے، "ہیڈلینک ایڈیشن" چھپتے ہیں۔ ایسوسی ایٹڈ پریس نیوز ایجنسی دنیا کا سب سے بڑا خبر رساں ادارہ ہے اور دنیا کا کوئی ملک بھی ایسا ہوگا جہاں یہ سرگرم عمل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارے کا کاٹاثر پیکر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا میں بین الاقوامی واقعات کے متعلق ایک ارب افراد کا نقطہ نظر اس ایجنسی کی ارسال کردہ خبروں کی بنیاد پر بنتا ہے۔ ایک دوسرا امریکی خبر رساں ادارہ

تھیمپول اور بین غازی کے بہتے عوام کا قتل عام کر رہے تھے تو اس آٹ امریکہ "لیسا کے خلاف تشہراتی جارحیت کی مرکب ہو رہی تھی اور اس رات اس نے ۵۰ مرتبہ لیسا کے عوام سے یہ اشتعال انگیز "اپیل" کی کہ وہ معرقلانی کا تختہ الٹ دیں چونکہ وہ "دہشت گردوں" کی حمایت کرتے ہیں۔ اور اس جارحیت سے امریکہ نے یہ توقع والہستہ کر رکھی تھی کہ رات کے اچانک ہوائی حملوں سے لیسا کے عوام میں ہلکد مچ جائے گی اور یامنی کا دور دورہ ہو جائے گا اور معرقلانی کو اقتدار سے ہٹا دیا جائے گا اس سلسلے سے ڈرامے میں لیسا کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ آزاد خارجہ پالیسی پر عمل کرنا چاہتا تھا اور اس نے واشنگٹن کی دھونس میں آنے سے انکار کر دیا تھا۔

بالکل اسی طرح کی ہلکد مچ گئے ہم واشنگٹن اور لندن نے مشترکہ طور پر شام کے خلاف شروع کی تھی۔ شام پر بھی ویسے ہی نفسیاتی دباؤ ڈالا گیا اور لیسا کی طرح اس پر بین الاقوامی دہشت گردی کے الزامات تھوپے گئے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ "واشنگٹن پوسٹ" نے الٹانک حادثوں کی ایک لمبی فہرست شائع کی جن کے لیے شامی حکومت کو موبہ الزام ٹھہرا گیا اور ان میں بہت سے واقعات ایسے تھے جن کا الزام پہلے لیسا کے سر تھوپا جا چکا تھا۔ شام کے خلاف ہم کے مقاصد لیسا مخالف ہم سے مماثلت رکھتے تھے۔ اس ہم کا مقصد شام کو آزادانہ خارجہ پالیسی ترک کرنے پر مجبور کرنا اور مشرق وسطیٰ کے مسئلے پر اس کے موقف کو امریکی مفادات کے تابع بنانا تھا مگر سامراجی قوتوں کو دونوں ممالک میں ہزیمت اٹھانی پڑی۔

ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے ترقی پذیر ممالک کے عوام اور بالخصوص عوام دوست اور جمہوری حکومتوں کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ اپنے عوام کو سامراجی ہلکد مچ اور ان کی جارحیت سے محفوظ رکھیں اور اس امر کے لیے اشد ضروری ہے کہ مقامی ذرائع ابلاغ کو اظہار کی مکمل آزادی میسر ہو تاکہ عوام کو خبروں کے حصول کے لیے سامراجی ذرائع ابلاغ پر انحصار نہ کرنا پڑے۔

پاکستان میں دور آمریت کے خاتمے اور جمہوریت کی بحالی کے بعد محترم بے نظیر بھٹو کی ولولہ انگیز قیادت میں پاکستان

امریکی حکومت خارجی پروپیگنڈے پر پانچ ارب ڈالر سالانہ خرچ کر رہی ہے

یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل تقریباً ۱۰۰ ممالک کے ۸۰۰ اخباروں اور ۳۰۰ ریڈیو اسٹیشنوں کو خبریں فراہم کرتا ہے۔

ان تمام پرائیگنڈہ اداروں کی مالک بڑی بڑی اجارہ دار کمپنیاں ہیں اور ان کا مقصد ترقی پذیر ممالک میں بڑے بڑے سرمایہ داروں اور امریکی حکومت کے سیاسی و معاشی مفادات کی حفاظت کرنا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات میں ترقی پذیر ممالک کے لیے امریکی نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ یا تو ہمارے ممکن دشمن ہیں یا پھر وفادار اتحادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی حکومت ترقی پذیر ممالک کو اپنے سیاسی و فوجی اثرات کے تحت لانے کی تگ و دو کرتی رہتی ہے تاکہ اپنے حریف سوشلسٹ ممالک اور آزادی کی تحریکوں کے خلاف حماد کو مضبوط کر سکے۔

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ ہی جاسکتی ہے کہ آٹھویں دہائی میں امریکی پرائیگنڈہ کا ہدف ایسے ممالک کے عوام ہوں گے جنہیں امریکی انتظامیہ اپنے مفادات کے لیے اہم ترین ممالک کے حلقے میں شامل کرتی ہے۔ اور ایسے ممالک کے خلاف پرائیگنڈہ ہم پہلے ہی تیز تر کر دی گئی ہے جن کے خلاف سامراجی امداد کے سہارے گرائے کے فوجی برسر پیکار ہیں ان ممالک میں گلا مؤذمیں، نکاراگوا اور بہت سے دوسرے ممالک شامل ہیں یہ ممالک سامراج کی طرف سے غیر اعلان شدہ جارحیت کے

سوشلسٹ ممالک کے بارے میں خبروں کی تشہیر اس طرح کرتا ہے کہ وہ بین الاقوامی سیاست میں امریکی مفادات کے تابع ہوں۔

امریکی افواج کے پاس دنیا کے مختلف خطوں میں پرائیگنڈہ کے لیے اپنے وسائل ہیں۔ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر خان ٹون سٹال نے "امریکی ذرائع ابلاغ" کے نام سے اپنی تحقیق میں بتایا ہے کہ امریکی مسلح افواج کے پاس ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات کے لیے تقریباً ۱۰۰ اسٹیشن موجود ہیں علاوہ ان میں دوسرے ممالک میں متعین امریکی مسلح افواج کے پاس بھی ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات کے لیے اپنے نظام موجود ہیں جن کی زیادہ تر نشریات ان ملکوں کے لوگوں کے لیے ہوتی ہیں جہاں یہ افواج تعینات ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ امریکہ کے اس وقت ۳۲ ممالک میں کوئی ۱۵۰۰ فوجی اڈے اور تعینات ہیں اور یہاں تعینات امریکی فوجیوں کی تعداد ۵۰ لاکھ ۳۰ ہزار ہے۔

امریکی وزارت دفاع بھی تیسری دنیا میں قارئین کے لیے کافی مولا شائع کرتی ہے مثلاً امریکی افواج کے ترجمان انڈیا میٹار اڈر سٹریٹس، اسکے بحرالکابل کے لیے ایڈیشن کے قارئین کی تعداد تقریباً دس لاکھ ہے ان قارئین کا تعلق جنوبی کوریا، تھائی لینڈ، ملائیشیا، فلپائن اور گرام سے ہے علاوہ ان میں منگولیا، افغانستان اور پریس انٹرنیشنل کو مغربی یورپ، مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے ۴۴ ممالک میں پڑھا جاتا ہے۔

یہ بتانے کی تو شاید ضرورت ہی نہیں ہے کہ امریکی ہلکد مچ ترقی پذیر ممالک میں رشتے عامہ کو لگام کرنے کی تگ و دو میں اپنی حکومت سے پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے سامراجی عزائم کے حصول کے لیے وہ پرائیگنڈہ میں امریکی حکومت کے دست راست کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مختصر اہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ میں پرائیگنڈہ کے سرکاری و پرائیویٹ ادارے ایک ہی سگے کے دو رخ ہیں۔

ترقی پذیر ممالک میں جہاں تک امریکی اطلاعات کے پرائیویٹ اداروں کا تعلق ہے تو یہ بات راز نہیں ہے کہ ان میں غیر ملکی سرمایہ کا تسلط کافی مضبوط ہے اور مقامی عنوانات کے تحت شائع ہونے والے بہت سے مواد کے پیچھے غیر ملکی سرمایہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ترقی پذیر ممالک میں سے تقریباً نصف ممالک انگریزی زبان سمجھی اور پڑھی جاتی ہے اس لیے امریکی اخباروں، رسالوں، کتابوں، فلموں اور ٹی وی پروگراموں کے لیے رسائی رکاوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جن ممالک میں ایسی رکاوٹ موجود ہے۔ وہاں امریکی پرائیگنڈہ مواد مقامی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ مثلاً "ریڈیو جیٹس" سا زبانوں میں شائع ہوتا ہے اور اس کی تعداد اشاعت ۱۸ ملین سے زیادہ ہے۔ مشہور امریکی

امریکی فوج کے پاس دنیا کے مختلف خطوں میں پروپیگنڈے کے اپنے ذرائع ہیں

پینیل پارٹی کی عوامی حکومت نے ذرائع ابلاغ کی مکمل آزادی کے لیے جو اقدامات کیے ہیں وہ پاکستان کے عوام کو سامراجی ذرائع ابلاغ کی جارحیت سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں دور رس اہمیت کے حامل ہیں اور پاکستان کے عوام پر امید ہیں کہ مکمل آزادی رائے کا یہ ماحول جمہوریت کے نوزائیدہ پورے کی نشوونما کے لیے مدد معاون ثابت ہوگا اور یہ پورہ مستقبل میں ایک تنومند شجر بن کر ہماری آئندہ نسلیں کو فیض یاب کرتا رہے گا۔

شکار ہیں اس کے علاوہ ان ممالک کو مکمل جارحیت کی دھمکیاں بھی دی جاتی رہتی ہیں۔

سامراجی ممالک ناپسندیدہ ممالک پر جارحیت کا ارتکاب کرتے وقت ان پر عام طور پر "بین الاقوامی دہشت گردی" میں ملوث ہونے کا الزام لگاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امریکی انتظامیہ جب لیسا پر جارحیت کی مرکب ہوتی تھی تو اس نے لیسا پر بھی بھونڈا الزام عائد کیا تھا اور اس جارحیت سے قبل اس ملک اور

اس کے راہنما معرقلانی کے خلاف نشرناک پروپیگنڈہ کی ہم چلائی گئی اور "واشنگٹن پوسٹ" کے انکشاف کے مطابق امریکی حکومت نے ذرائع ابلاغ کو غلط اطلاعات فراہم کرنے کی ہم چلائی تھی مگر اس کو ذرائع ابلاغ اور ان کے ذریعے رائے عام کو دھوکہ دینے کی ہم کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ اس ہم کا مقصد معرقلانی کو اقتدار سے ہٹانا تھا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے پورے مشرق وسطیٰ میں غلط اطلاعات کی بھرمار کر دی گئی تھی



بھوک کا حضرت

فینافنام

لوگوں کو بھوکا مرنے سے بچانا ہے تو ہر حالت میں دنیا سے اسلحہ کا خاتمہ کرنا ہوگا۔

ہر ایک منٹ میں بھوک کی وجہ سے چوبیس انسان موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

اور ہر سال تیرہ سے اٹھارہ کروڑ لوگ بھوک کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔

اعلاؤں کے ہاتھ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھوک سے مرنے والوں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا ہے اور یہ بے بس اور مصوم انسان بڑی خاموشی اور آہستگی کے ساتھ اپنے لڑکھڑاتے قدموں سے موت کے قریب سے قریب تر جاتے جا رہے ہیں۔ ہر منٹ میں چوبیس انسان موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں، ان میں سے اٹھارہ بچے ہوتے ہیں جن کا پھول جیسا نازک بدن زیادہ دنوں تک بھوک کو برداشت کرنے کا مقصد نہیں ہوتا۔ یہ ایک نہایت اہمناک صورتحال ہے۔

ایسی صورت حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام اور حکومتیں آپس میں مل کر بھوک اور افلاس کو مکمل طور سے آخر کی طرح ختم کر سکتی ہیں۔

یہ مسائل جب اناٹولے گرومیکو کو روس کی اکیڈمی آف سائنس کے ایک بڑے علمبرداروں میں، جی اسٹاروچو کو امریکہ کے پریذیڈنٹ "بھوک اور افلاس" کے اعلیٰ علمبرداروں اور

بی۔ لیوی جو کہ میڈیکل سائنس میں کئی سالوں سے کام کرتے ہیں، تو ان صاحبان نے مختلف مشورے پیش کئے جن کی مدد سے بھوک اور افلاس کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

انٹولے گرومیکو نے کہا کہ بھوک کا مسئلہ صرف یہ کہ شدید بے بلکہ یہ مسئلہ کہ زمین پر بدہشت ناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ دنیا کا ہر باغیچا انسان بھوکا رہ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ اور ہم یہ محسوس کر رہے ہیں تو دنیا میں ہزاروں لوگ بھوکے ہیں اور اس بھوک کا تصور بھیجے ناممکن ہے۔ انسان عمومی طور پر اور بچے بطور خاص...

ایک نازک اور کمزور مخلوق ہیں اس لئے سب سے پہلے بھوک ان مصوم بچوں کو ایک حضرت کی طرح نکل جاتی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق تقریباً پندرہ کروڑ بچے بہت چھوٹی عمر میں بھوک کا شکار ہو جاتے ہیں یہ مسئلہ ایک عجیب و غریب شکل اختیار کر گیا ہے اور اس مسئلے سے سب سے زیادہ افریقہ، ایشیاء اور لاطینی امریکہ متاثر ہوتے ہیں۔

خط استوا کے دونوں طرف بھوک کا مسئلہ موجود ہے اور دن بدن یہ مسئلہ سنگین ہوتا جا رہا ہے۔

اس بارے میں جی۔ اسٹاروچو کا کہنا ہے کہ جس قدر لوگ بھوک سے ختم ہو رہے ہیں وہ تعداد تقریباً اتنی ہی ہے جتنی کہ ہیروشیما ایٹم بم چھٹنے سے اموات ہوئی تھیں۔

ہیروشیما جیسی تباہی برپا ہونے کے بعد جاری دنیا میں رونما ہوتی ہے یہ کوئی نیا دن نہیں بھوک سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ہیروشیما میں ہلاک ہونے والوں کے برابر ہوتی ہے

بہر حال پرايٹم بم کے گرانے جانے سے جو ہولناک سانحہ رونما ہوا اس نے تاریخ کی دوش کو بدل دیا۔ آغوش ناک امریکہ کو بھوک کا مسئلہ جس قدر شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے ہم اس پر اپنی توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے

کہ لوگ بھوک کی وجہ سے مسلسل موت کا شکار ہو رہے ہیں؟ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ دنیا میں چنانچہ اسلحہ پر خرچ ہو رہا ہے وہ انسانی ضروریات پر نہیں خرچ ہو رہا ہے اور یہ بھی کہ برصغیر ہوتی آبادی، انقلابی پس منظر اور سیاسی مسائل بھی بھوک کے خاتمے میں رکاوٹ ہیں۔ دنیا میں اس وقت خوراک کی اتنی مقدار موجود ہے کہ ہم جتنے انسانوں کو کھانا فراہم کر سکتے ہیں ان سے ڈیڑھ گنا زیادہ افراد کو کھانا مہیا کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لئے ہمیں بڑی ثابت قدمی سے اپنے مسائل سے نمٹنا ہوگا۔

ان مسائل کے حل کا ذکر کرتے ہوئے اناٹولے گرومیکو نے کہا کہ ہم جب ایک ایسی دنیا کے بارے میں سوچتے ہیں جس کے عوام بھوکے نہ ہوں تو یہ کوئی خواب نہیں ہے بلکہ ایسی دنیا کا وجود ممکن ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ساری حکومتیں آپس میں مل کر انسانی کو درپیش مسائل کو حل کرنے کی کوششیں کریں۔ ہمیں اپنی ساری توجہ اس طرف مبذول کرنی چاہیے کہ سارے ممالک کے لوگ جن میں روس اور امریکہ کے لوگ بھی شامل ہوں ایسی دوستانہ فضا قائم کریں کہ ہمارے تعلقات ہر حکومت سے دوستاں اور مصفاہ بنوں اور ہم ایک دوسرے کے سیاسی نظریات کے حریف ہوتے۔

یہاں تک کہ دوسرے کے بھی خواہ ہوں اور انسانی کو بہتر ماحول فراہم کرنے کے لئے کوشاں رہیں۔

اگر ہمارے تعلقات دوستانہ نہ ہوں تو ہم ایک دوسرے کو مصدقہ و حریف کے شعبے میں مانی طور سے مستحکم کر سکتے ہیں۔ دوسرے کے بھی یہی اقدامات کئے ہیں اور دوسرے ممالک کی حکومتوں کی توجہ تحریف اسلحہ کی طرف لائی ہے۔

روس کی کوشش مسلسل جاری رہی ہے کہ دنیا کو ایٹمی ہتھیاروں کے خطرات سے آزاد کر لیا جائے۔

اگر ہم ہلکے ہتھیاروں کا استعمال ترک کر دیں تو کئی غریب ممالک کی اقتصادی حالت بہتر کی جاسکتی ہے اور اس طرح بڑی حد تک بھوک کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اگر ہمیں دنیا سے بھوک کا خاتمہ کرنا ہے اور لوگوں کو بھوکا مرنے سے بچانا ہے تو ہمیں ہر حالت میں دنیا سے اسلحہ کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ہر چیز کا آپس میں تعلق ہے۔ اگر ہم اپنے سیاسی نظریات پر لڑتے رہے تو کبھی بھی بھوک کا خاتمہ نہیں کر سکیں گے اور وہی پس منظر کی اس دلدل میں دھنستے چلے جائیں گے جب کہ مثبت قدموں کو لوگوں کو بھوک کا شکار ہونے سے بچا سکتا ہے۔

جی اسٹاروچو نے ان مسائل کے حل کے بارے میں کچھ اس طرح کہا۔ حکومتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی کوتاہی کی تلافی کریں اور یہ حکومتوں ہی کے ہاتھ میں ہے کہ وہ بھوک کو ختم کریں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہم اس بات کے اہل تھے کہ نازی جرمنی کو روک سکتے۔ اس وقت روس اور امریکہ بھی ایک دوسرے کے مددگار اور حامی تھے۔ اب پھر ہمیں ایک عمدہ موقع حاصل ہوا ہے کہ ہم بھوک کا خاتمہ کر سکیں۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانیں کہ روس اور امریکہ کے سربراہان بے عملت ایک ایسے معاہدے پر ضرور فوکل کر رہے ہیں جس پر عمل کرنے سے بھوک کا مکمل خاتمہ ممکن ہے۔ اس وقت ساری انسانی کوششیں بھوک سے ہے اور ہمیں ماضی کے تعلقات کو بھلا کر حال کے تعلقات پر توجہ دیتے ہوئے اس مسئلے کا سدباب کرنا چاہیے۔ امکان اس بات کا ہے کہ روس اور امریکہ اپنے سارے سیاسی اختلافات کو نظر انداز کر کے بھوک کے خاتمے اور انسانوں کو درپیش دوسرے مسائل کا حل تلاش کریں گے۔

روس اور امریکہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یکا یک

کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جی اسٹاروچو نے کہا۔ مثال کے طور پر آپ کے تصور کیجئے کہ جینو میں ایک کانفرنس ہال میں ایک بہت بڑی میز ٹھہرے کے وسط میں رکھی ہوئی ہے اور دو آدمی اس میز کے سر اور دوسرے کے سر کے درمیان گویا پلوٹس اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے چند منٹ پہلے ختم ہونے والی ایک بہت مختصر پریس کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ہدی کے اختتام تک وہ بھوک کے خاتمے کی کوششیں کریں گے۔ اس کے بعد آپ ایک اور پریس کانفرنس کا تصور کیجئے جو کہ اس پہلی والی کانفرنس کے سچے میٹے بعد ہو چکی ہے اور اس پریس کانفرنس میں امریکہ کے صدر روس کے صدر اور افریقی ریاستوں کے سربراہان بھی موجود ہیں اور انہوں نے مشترکہ طور پر اعلان کیا ہے کہ وہ بھوک کے مسئلے سے نمٹنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے اور پانچ سال کے اندر ان کے ممالک سے بھوک کے خاتمے کے لئے انھوں نے جو ترقیاتی منصوبے ترتیب دیئے ہیں ان سے مددیں گے۔

یہی وہ وقت ہے جب کوئی قدم اٹھایا جاسکتا ہے جو بھوک کے خاتمے کے لئے ہو اور ایسے سیاسی ماحول کی ضرورت ہے جو اس سے مطابقت رکھتا ہو۔ میرے خیال میں یہ بات ممکن ہے۔ اب یہ بہت آسان ہے کہ ہم تحریف اسلحہ کے مسئلے کو اس نظام کے تحت انجام دیں جو بھوک کے خاتمے کے لئے شروع کیا گیا ہے۔ جی اسٹاروچو اس بات پر متوجہ کرتے ہوئے اناٹولے گرومیکو نے کہا کہ معاہدے صرف ممکن ہی نہیں ہیں بلکہ ضروری بھی ہیں اور ان کا کوئی بدل نہیں ہے۔ تیسری دنیا میں بھوک کا بوسند ہے اسے ساری حکومتیں مل کر حل کر سکتی ہیں۔ اس بارے میں بی بی سی نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا۔ نظریاتی اختلافات اس وقت بڑھ جائیں گے جب یہ فیصلہ کرنے کا وقت آئے گا کہ کس ملک کی پہلے امداد کی جائے۔ ان سب معاملات کا بھی تقیہ ہونا چاہیے۔ مثلاً چیک کے مسئلے کو لیں۔ اٹھارویں صدی میں چیک کے خاتمے کے لئے دیکھیں جو ویس آئی تھی۔ اور ۱۹۶۰ء

ہر ایک منٹ میں بھوک کی وجہ سے ۲۴ انسان موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

کے وسط میں امریکہ، روس اور دوسرے ممالک کے محنت کے اداروں نے چیک کر پوری دنیا سے ختم کرنے کے لئے کوششیں کیں جن کے مثبت اثرات دس سال کے اندر سامنے آ گئے۔

جب بھی علوم اور حکومتیں کو مرض پر موجود کسی مسئلے کے حل تک پہنچنا چاہتے ہیں تو وہ اس مسئلے کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اصل اور اہم چیز یہ ہے کہ آپ کے اہم سیاسی شعور موجود ہو۔

اس بارے میں اناٹولے گرومیکو نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اس ضمن میں سائنسٹ ایک بہت اہم دول ادا کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہم نے اور بہتر راستے تلاش کریں جو کہ بین الاقوامی تعلقات کو بہتر طور سے استوار کر سکیں۔

ہمیں ایک نئی سیاسی سوچ کی جستجو کرنی چاہیے جس کے حوالے سے دنیا جنگوں سے اور بھوک سے پاک ہو سکے۔ اس فیصلہ العین کی تکمیل کے لئے دانشوروں کو چاہیے کہ وہ سیاست دانوں کو مؤثر اور ایسی سائنسی سفارشات پیش کریں جو ان مسائل کا حل پیش کر سکیں۔

دنیا سے بھوک کا خاتمہ صرف جو نیلے نعروں اور فالتو خولی باتوں سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ بھوک کے خاتمے کا حل یہ ہے کہ ہم بڑے پائے پر محسوس اقدامات کریں۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ تحریف اسلحہ کی کوشش بہت خفیہ کی جائے تاکہ صورت حال میں واقعی بہتری رونما ہو سکے۔

سوویت مسلمان

ناظم محمد

سوویت یونین میں مسلمانوں سے کوئی امتیاز نہیں برتاجاتا۔

کسی

سبھی طبقاتی سماج میں طبقاتی کشمکش کا عمل بڑا وسیع ہوتا ہے۔ یہ طبقاتی جنگ مختلف محاذوں پر بیک وقت لڑی جاتی ہے۔ جیسے معاشی، سیاسی اور نظریاتی وغیرہ۔ ان سب میں نظریاتی جنگ بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیونکہ نظریہ ہی ہمیں جدوجہد کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ طبقاتی سماج کی ابتداء ہی سے استحصال اور رجعتی طبقے مظلوم عوام کی ذہنی پس ماندگی کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ کبھی تو قسمت اور کرم کے فلسفے کو غریبوں کا ہمدرد بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور کبھی امیر یا بادشاہ کو خدا کا نائب یا ظلی الہی اور ظلی سبحانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور کبھی لوگوں کو مہر، عاجزی اور اطاعت گزاری کے آپدیش دیے جاتے ہیں۔

ہر دور میں ترقی پسند انداز خیالات کی بیخ کنی کی کوششیں کی جاتی ہیں اور انھیں خطرناک، مذہب دشمن، محض خلاق اور نہ جانے کیا کہا جاتا ہے۔

کچھ لوگ تو اپنے طبقاتی مفادات کی وجہ سے ایسا پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور کچھ انہی کو عقلی اور سوجھ بوجھ سے اس دور و رخ گوئیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آج کے دور میں چونکہ ذرائع ابلاغ بہت ترقی کر چکے ہیں اس لیے عوام کی سوچ بنانے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن ذرائع ابلاغ چونکہ دولت سے کام کرتے ہیں اس لیے اسی طبقے کے پاس ہوتے ہیں جس کے ہاتھ میں دولت کا انکار نہ ہوتا ہے۔ یعنی استحصال طبقہ اور

پس ماندگی ان قوموں کو انقلاب کے وقت درشتے میں ملی تھی۔ انقلاب کے بعد یونین نے بار بار یہ بات کہی کہ مظلوم اور جبر کے شکار لوگوں کو محض سیاسی آزادی دینا کافی نہیں ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ امداد بھی دینی چاہیے کہ وہ کم سے کم وقت میں اپنی اقتصادی عدم مساوات سے چھٹکارا پانے کے قابل بن سکیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی خیال رہے کہ وہ سوویت ملک کے لیے سخت آزمائش کا دور تھا۔ ملک دشمنوں کے نرغے میں تھا اور اس کا گلا گھونٹا جا رہا تھا۔ ماسکو اور پتھر ڈراؤ کے شہریوں کو راشن میں ہر روز اجود پچاس گرام روٹی ملتی تھی۔

آج سوویت مشرق کی جمہوریا میں ایسے علاقے ہیں جو خوب پھل پھول رہے ہیں۔ وہاں جدید طرز کی ترقی یافتہ صنعتیں ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے زرعی ادارے ہیں اور ترقی یافتہ ثقافت ہے۔ وہاں کا دورہ کرنے والے لازمی طور پر اس ترقی کو محسوس کرتے ہیں۔ ارحمن کے اوقاف مذہبی امور اور حفاظت مقدسہ کے وزیر کمال شرف نے وہاں کے دورے کے بعد کہا تھا۔

”سوویت یونین میں ہر جگہ یہ بات دیکھی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کتنی بہتر ہو چکی ہے۔ انھوں نے بے حرکتی کی زندگی نیز اقتصادی پس ماندگی سے صنعت اور زراعت میں یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کی سطح تک سفر کیا اور جدید سائنس کی بلندیوں حاصل کیں۔

سوویت معاشرہ بھی ایک انسانی معاشرہ ہے وہاں فرشتے نہیں بتے۔

وہ اس سے اپنے مفادات کے تحفظ کا کام لیتا ہے یعنی اپنے طرز فکر کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کرتا ہے جو کسی بھی ترقی پسند نظریے اور انقلابی سوچ کو قبول نہ کرے اور اس سے دور بھاگے۔ آج کے دور میں اس کے لیے ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات و رسائل وغیرہ سب استعمال کیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں ریڈیو اور ٹی وی تو خیر براہ راست حکومت کے کنٹرول میں ہیں اور اخبار و رسائل وہی لکھتے ہیں جو ان کے مالکان کے فائدے میں ہو اور گھبرانا کان استعمال طبقے سے سختی ہوتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے وہ جموئی خبروں اور رپورٹوں کے پلندے لگا دیتے ہیں۔ ایسے اخبار و رسائل کسی معاشرے کی انقلابی سوچ کے لیے ہم قابل کام کرتے ہیں۔

ایسا ہی ایک ہفت روزہ ”تحقیر“ ہے جو مذہب کے لحاظ سے انتہائی رجعتی۔ اور قابل نفرت کردار ادا کر رہا ہے اس کے شماروں میں رپورٹیں شائع ہوتی ہیں جن میں ایک بار پھر سوویت یونین اور خاص طور پر تاشقند کے بارے میں مبالغہ گوئیوں کے تمام ریکارڈ توڑے گئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ”وسطی ایشیاء کے مسلمان اپنی اور غربت کا شکار ہیں“ اور اصل

وسط ایشیاء، قزاقستان اور قفقاز و علاقہ دار کا کے مسلمانوں کو تعلیم اور ثقافت کے میدانوں میں انتہائی پس ماندگی ماضی سے درشتے میں ملی تھی۔ بیسویں صدی کے شروع میں وسط ایشیاء کی آبادی ۹۵ فیصد ان پڑھ تھی اور آج وہاں عام اعلیٰ تعلیم رائج ہے۔

مذکورہ ہفت روزہ نے اپنی ایک اشاعت میں یہ بھی لکھا تھا کہ سوویت یونین میں پڑھنے والے غیر ملکی طالب علموں کو لینن کے تحریر کردہ سائنسی کمپوزم کے بنیادی نکات پڑھائے جاتے ہیں جن کی مدد سے کسی ملک میں انقلاب برپا ہوتا ہے۔ اور ا متعلقہ ملک میں بے چینی، بے اطمینانی معاشرتی بدحوالی، بد امنی، خلفشار اور مالی بے بسی و عدم تحفظ کی فضا۔

ثانیاً حکومت کی کمزوری اور اس کا عدم استحکام۔ ثالثاً عوام کا اپنی حکومت اور درجہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا۔

رابعاً کمپوزٹ نظریات کی حامل پارٹیوں کی موجودگی اور ان کا منظم ہونا اور پھر انقلابی عمل کی قیادت کرنا۔ آخر میں لینن اور مارکس کے عملی اصولوں کی تقلید کرنا جو سب سے اہم جز ہے۔

ہم ان کے مضمون میں انھوں نے غفلت میں اپنے قارئین کو انقلابی اصولوں سے روشناس کرایا اور یہ سمجھنے میں مدد دی کہ انقلاب کیسے برپا ہوتا ہے۔ میں انھیں اتنا اور بتا دوں کہ معاشی بدحوالی، رشوت ستانی اور دیگر مہنگائی وغیرہ لوگوں کو خود اپنی حکومت اور موجودہ فرسودہ نظام کے خلاف اٹھاتے ہیں۔ حکومت کی کمزوری اس کا عدم استحکام اور عوام کا اپنی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا کوئی مصنوعی چیز نہیں ہوتی نہ ہی آرڈر پر تیار کی جاتی ہیں۔ بلکہ شرا ہوا نظام خود ان چیزوں کو پیدا کرتا ہے۔

ترقی پسند پارٹیوں کی موجودگی اور ان کا منظم ہونا وقت کی اہم ضرورت ہوتا ہے جس کے بغیر نظام کی تبدیلی نہیں آسکتی۔ لینن اور مارکس کے عملی اصولوں اور تجربوں کی تقلید ایک اچھا انسان بننے کی دعوت دیتی ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی ان گریبان غریب عوام کے لیے وقف کر دیں۔ یہ تنگ نظر مذہبی جنونی کیا جانی عوام کی حالت یہ مہم سب سے بھی اہم کنڈیشنز چاہتے ہیں اور جنگ کے لیے ٹینک بھی (واجب رہے کہ کچھ عرصے پہلے سعودی عرب نے فرانس سے ایرکنڈیشنڈ ٹینک خریدے ہیں)

جماعت کے اس ہفت روزہ جس کا نام ہم ”تحقیر“



رکھا ہے، نے ایک خبر اور دی ہے کہ ایک پاکستانی طالب علم کئی سالوں سے روس میں موجود تھا۔ جسے ”جی بی“ والوں نے اس وقت رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جب وہ ڈالر اور روپے کی اسمگلنگ میں مصروف تھا۔ بھائی میں تو کہتا ہوں آفرین ہے اس قانون نافذ کرنے والے ادارے پر جو اپنے ملک میں غیر قانونی حکومتوں پر نظر رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں تو تھانے کے باہر جو اکھیلا جاتا ہے اور تھانے کے اندر رشتوں کی جالی ہیں۔ اسمگلروں کا پول بالائے کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

اس نے اپنی ایک اشاعت میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہاں مسجدوں میں عرباں رقص ہوتے ہیں اور جو تصویر شائع کی ہے اس میں مسجد کے دروازے سے کچھ لوگوں کو اندر داخل ہوتے دکھایا گیا ہے۔ افسوس کہ وہ کھلے دروازے سے اندر کی تصویر نہ لے سکے ورنہ ان کے جھوٹ کا پول کھل جاتا۔ ہم کسی اور کا نہیں بلکہ سابق وزیر محمود ہارون کا حوالہ دیتے ہیں۔ جب وہ وفاقی وزیر تھے تو پاکستانی مسلمانوں کے وفد کے ساتھ سوویت یونین گئے تھے والیسی پرانہوں نے کہا۔

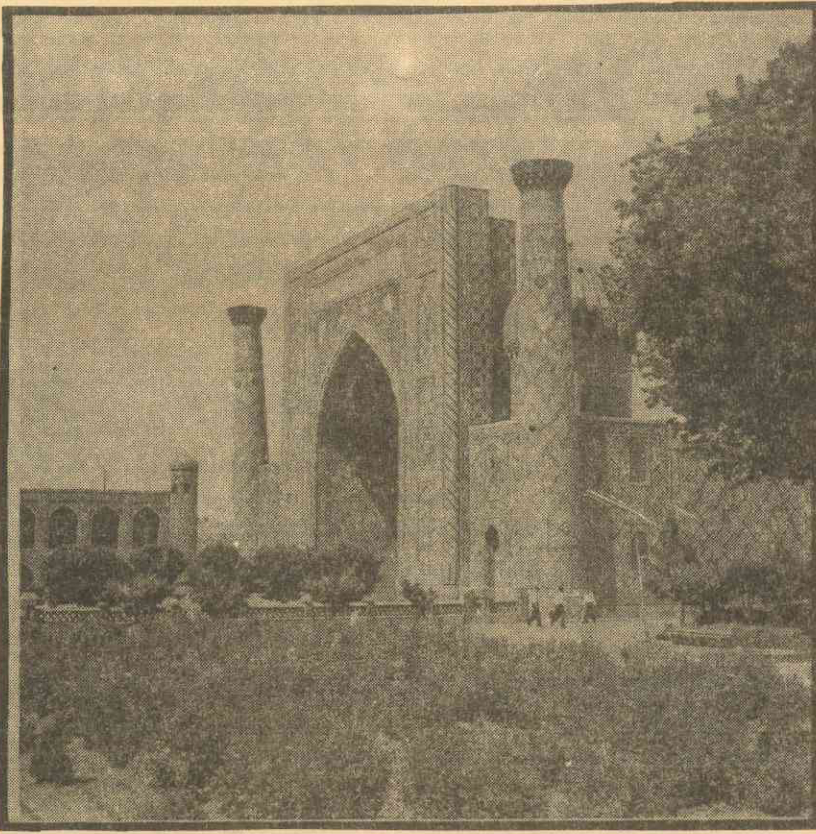
”سوویت یونین میں مسلمانوں سے کوئی تفریق نہیں ہوتی جاتی۔ سوویت یونین ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ ہم مسجدوں اور اسلامی کتب خانوں میں گئے اور مسلمانوں کو نماز ادا کرتے دیکھا۔ مسجدوں کو اچھی حالت میں رکھا جاتا ہے اور ان کی باغات مرمت ہوتی رہتی ہے۔ یہی حال مدرسوں، مقبروں اور دوسری مسلم یادگاروں کے ساتھ ہے۔“

جن دنوں نے سوویت یونین کی اسلامی تنظیموں کی موت پر وہاں کا دورہ کیا ان میں اردن، تیونس، عرب جمہوریہ یمن، مراکش، ترکی، شام، پاکستان، لبنان، چاڈ، سینیگال، بنگلہ دیش، ہندوستان اور افغانستان اور بہت سے دوسرے ملکوں کی اسلامی تنظیموں کی سرکردہ شخصیات شامل ہیں۔ انہوں نے ازبکستان، قزاقستان، تاجیکستان، کرغیزستان، ازبکستان، تاتاریا اور بکیرے کے مختلف علاقوں میں اپنے ہم مذہب بھائیوں سے ملاقاتیں کیں۔ علامہ عبدالمالک سندھی کے ایک شاگرد مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے اپنے دورہ سوویت یونین کے دوران جو کچھ دیکھا اس طرح بتایا۔

”سوویت یونین میں بہت سی باتیں جو میں نے دیکھیں میرے لیے خوشگوار طور پر حیران کن تھیں۔ مثلاً مجھے یہ دیکھ کر سچ بچ خوشی ہوئی کہ وہاں مسلمانوں اور دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ بھی کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جاتا اور وہ بقیہ سوویت عوام کے ساتھ مادی طور پر ایک بڑے خاندان کے ارکان کی طرح رہتے ہیں۔ سارے سوویت دیس میں ہر جگہ خواہ وہاں مسلمانوں کی آبادی ہو یا غیر مسلموں کی ترقی کی شرح یکساں ہے۔“

پچھلے چند سالوں میں سوویت یونین میں جو تخلیقات شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے پہلے عظیم شاعر فردوسی کی طویل رزمیہ نظم ”شاهنامہ“ کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ لازوال نظم جو تقریباً ہزار سال پہلے لکھی گئی تھی ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۱ء کے درمیان فارسی کی نو جلدوں میں شائع ہوئی۔ ۱۹۶۳ء میں قرآن مجید کا نیارویں ترجمہ شائع کیا گیا جو تیس سال کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ ”بدائع الوقائع“ عظیم صدری کی کتاب ”مکستان“ التاریخ المنصوری، ”دستور الخلیف“ ذہان نامہ، ”المنازل ولدیارہ“ نامہ عالم آرائی نادرہ، ”اور مجامع التواضع، کے علاوہ امیر خسرو دہلوی کی مشہور مثنوی ”نبی مجنون“ شیریں خسرو، مطلع انوار اور بہشت بہشت شامل ہیں۔

ترک شاعر مہر کی خالق کی تخلیقات، مکرر شاعر احمد خانی کا کلا علی شیر نوائی کا دیوان، عمر خیام کی رباعیات، عبدالرحمن جامی



کی مثنوی، نبی مجنون اور ظہیر الدین بابر بادشاہ ہند کا فن حرفوں کے بارے میں ایک رسالہ بھی شامل ہے۔

السیونی، لومعلی سینا اور امام بخاری کی تقریبات بھی منائی گئیں اور ان کی شہرہ آفاق کتب ”قانون“ کی پانچوں جلدیں آدھیک اور روسی زبان میں شائع کی گئیں اور صحیح بخاری بھی چھاپی گئی ہے۔ جماعت کے لکھنے والے ان سب چیزوں سے بے خبر ہیں۔ انھیں ابھی بہت مطالعے اور وسیع

سوویت یونین میں سب بہت اچھا ہے۔ نہ ہی میں سوویت یونین کو ہمارے ملک کے چند عقیدہ پرست دانشوروں کی طرح ”ارض جنت“ سے تشبیہ دینا چاہتا ہوں۔ سوویت معاشرہ بھی ایک انسانی معاشرہ ہے وہاں پفرشتے نہیں بستے۔ یہ بہت لمبی حقیقت ہے کہ ماضی میں سوویت یونین کے حکمرانوں اور کمیونسٹ پارٹی نے فاش غلطیوں کی ہیں جس کی وجہ سے سوویت معاشرہ جو دکھاوا ہوا۔ لیکن اب سوویت

بیسویں صدی کے آغاز میں وسط ایشیا کی ۹۵ فیصد آبادی ناخواندہ تھی۔

معاشرے میں بہت گہری تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور ”گلاسٹوت“ کی نئی پالیسی نے اظہار و رائے کی بہت زیادہ آزادی دے دی ہے اس لیے وہ مسائل جواب تک دیے ہوئے تھے اب سر اٹھا رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان مسائل کا سوال ہے تو یہ پورے سوویت عوام کے لیے ہیں نہ صرف مسلمانوں کے لیے۔ مسلمان وہاں پر اتنے ہی بہتر مواقع کے حقدار ہیں جتنے کے غیر مسلم۔ یہ ضرور ہے کہ وہ مسلمانوں میں کچھ ایسے بزرگان افسران اور عہدیدار رہے ہیں جنہوں نے سوویت معاشرے کو نقصان پہنچایا ہے جس میں ایک بڑا نام ”شرف رشیدوف“ کا ہے جس نے دشمنستان اور بدعنوانی کے ذریعے سوویت عوام کی ترقی میں بہت رکاوٹ ڈالی۔

سوویت مسلمانوں کی بہتری سوویت معاشرے کے سارے عوام سے جڑی ہوئی ہے اور اس کے لیے سوویت یونین کے مسلمان بھی بڑی جدوجہد کر رہے ہیں۔ سوویت یونین نے دوسری جنگ عظیم میں بھی اپنے سارے عوام شامل سوویت مسلمانوں کی قربانیوں سے فتح حاصل کی تھی اور اب اس تعمیر نو میں بھی سوویت مسلمان سارے سوویت عوام کے شانہ بہ شانہ ہیں۔

النظری کی ضرورت ہے جس کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ اپنے ہفت روزہ میں ناخشنود کی پرانی آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”بولنے شہر میں لوگوں کے مکانات زیادہ تر مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ سڑکیں اور گلیاں بھی تنگ ہیں۔۔۔۔۔۔ بوسیدگی اور خستہ حالی کے باوجود لوگ اپنے انہی مکانات میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ پورے کاپورا کنبرا ایک ہی گھر میں رہتا ہے جو سوویت حکام کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اشتراکی حکمران نے نئے فلیٹس میں شامل بلند بالا عمارات بنا کر لوگوں کو ان میں رہائش کی ترغیب دیتے ہیں۔“

کاش کہ ہمارے ملک میں بھی ایسی حکومت ہوتی جو غریبوں کو بوسیدہ اور پرانے مکانات سے نکال کر نئے نئے فلیٹس میں مشتمل بلند بالا عمارات میں رہنے کے مواقع بنیا کرتی۔ اچھی بات میں سے بھی برائی ڈھونڈ نکالنے والوں کی مثال بالکل اس مٹی کی طرح ہوتی ہے جو صاف ستھری چینی میں چھوڑ کر گندگی کا غلاظت پر جا کر بیٹھتی ہے۔ میری مندرجہ بالا باتوں کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ

المیہ شکاگو کا پس منظر

سرمایہ داری نظام کے تسلط سے امریکی عدلیہ بھی خود کو محفوظ نہ رکھ سکی۔

محمد تقی

امریکہ

میں صنعتی ترقی کا دور ۱۸۲۰ء سے شروع ہوا جس کے ساتھ ہی نئے سماجی اور سیاسی نظریات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ قدیم، روایتی تصورات کی جگہ آہستہ آہستہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامی تصورات ابھرنے لگے۔ جیسا کہ بتاتے سماج میں ہمیشہ ہوتا آیا ہے ابتدا میں ان تصورات کا دائرہ اثر زیادہ سے زیادہ عوام الناس کے مفادات میں تھا۔ کل تک جو نظریات محض مراعات یافتہ طبقات کے مفادات اور حق میں تھے ان کی جگہ ایسے نظریات جنم لینے لگے جو عام انسانوں کو بھی زیر بحث لانے لگے تھے۔ نظریات میں اس تبدیلی کی ابتدا مذہبی تصورات میں تبدیلی سے ہوئی RALPH WALDO EMERSON (داعف والڈوا ایمرسن) جو خود ایک پادری تھا روایتی مذہبی تصورات کی جگہ نئے مذہبی تصورات کی تبلیغ کرنے لگا۔ PURITAN مذہب کے اس عقیدے کے مقابلے میں کہ انسان نا اہل اور غلط پتلا ہے ایمرسن EMERSON نے انسان کو فطرتاً اچھا گردانا۔ کل تک مذہبی تصورات انسان کی اخلاقی برائیوں کو معاشرے کی تمام برائیوں کی اصل وجہ بتاتے تھے ایمرسن نے اس سے اختلاف کیا اور معتدعہ مذہب کی جانب پیش قدمی کو اس نے انسان کی ترقی سے تعبیر کیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ تمام انسانوں کو مساوی تصور کرتا ہے۔ امریکہ کے ابھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ معاشرے میں ایک طرف تو معاشی اور سماجی تبدیلی کے باعث نئے نئے لوگ آئے دن معاشی ترقی کی منازل طے کر رہے تھے جس کے نتیجے میں ان کے سماجی رتبے بھی بلند ہو رہے تھے دوسری طرف سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کے تقاضے تھے جو تمام لوگوں کو مختلف چھوٹے بڑے طبقات سے نکال کر صرف تین بڑے طبقات سرمایہ دار، جبری پورژر اور مزدوروں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس سطح تک پہنچنے کے لیے ابھی امریکی معاشرے میں کئی ایک رکاوٹیں موجود تھیں۔ یہ وہ دور تھا کہ جب NORTH AMERICA ایک منقطع علاقے کے طور پر ابھرتا تھا اور جنوبی امریکہ SOUTH AMERICA ابھی ایک ایسے جاگیردارانہ زری علاقے کی حیثیت سے اپنا وجود رکھتا تھا جس کی بنیادیں سیاہ فام غلام باشندوں پر قائم تھیں۔ یہ زری علاقہ ملکی سیاست میں جمہوری اصول کے تحت پارلیمنٹ میں ایک واضح حیثیت رکھتا تھا جو ملکی قوانین اور آئین پر اپنا اثر رکھتا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں امریکی سیاست پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے خانہ جنگی تک ان دونوں علاقوں میں ایک دوسرے کے خلاف مسلسل کشمکش جاری رہی جس کا اختتام آخر کار صنعتی علاقے کی فتح کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن خانہ جنگی سے قبل ہم امریکی معاشرے میں ایسی رفاہی تنظیمیں ابھرتی دیکھتے ہیں جو اپنے وقت میں کافی ترقی پسند اور انسانی فلاح و بہبود کی حامل تھیں۔ مثلاً سیاہ فام باشندوں کی غلامی کی مخالفت

تنظیمیں، قیدیوں کے لیے سہولتوں کی حامی تنظیمیں، قرص کے باعث قید بندی کی مخالفت، قید کے دوران کوڑوں کی سزا کی مخالفت اور مزدوروں کے لیے کم از کم ۸ گھنٹے اوقات کار کا مطالبہ کرنے والی تنظیمیں۔ بدلتے ہوئے سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچوں کا اظہار ہمیں امریکہ میں اس وقت ابھرنے والی مختلف سماجی اور سیاسی تحریکوں سے بھی ملتا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے، ملازمت کرنے اور ملکیت رکھنے کا حق حاصل نہ تھا۔ لیکن اسی دوران خواتین کے حقوق کے مطالبات نے زور پکڑنا شروع کیا عورتوں کے لیے کالج کی ابتدا ۱۹۳۰ء میں ہوئی اگرچہ کہ وہ کافی عرصے تک کوئی نمایاں کارکردگی نہ دکھا سکے۔ ۱۸۳۹ء میں ریاست مس سسی پی (MISSISSIPPI) نے ان خواتین کو درست کرنے کا بیڑہ اٹھایا جو عورتوں کے ملکیت تک کو اس کے شوہر کی ملکیت قرار دیتے تھے اور ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۰ء تک کئی دوسری ریاستوں نے بھی خواتین کے حق میں قوانین میں تبدیلیاں کیں۔ ۱۸۴۸ء میں نیویارک میں عورتوں کا ایک کنونشن ہوا جس میں عورتوں کے لیے مساوی سماجی اور سیاسی حقوق کا مطالبہ بھی کیا گیا لیکن خود عورتوں کی اکثریت نے اس مطالبے کی حمایت نہیں کی۔ اس کنونشن کے تقریباً چالیس سال بعد کہیں جا کر عورتوں کو ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہوا اور وہ بھی صرف ایک ریاست میں۔

اسی دور میں پبلک اسکولز (تعلیم عامہ) کے لیے تحریکوں نے بھی جنم لینا شروع کیا اور یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ تعلیمی اداروں کی اعانت حکومت کی ذمہ داری ہو چلیے۔ اس وقت تک تعلیم کو سرکاری ذمہ داری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پرائمری سطح تک پرانی مذہبی روایت کے مطابق اسکولوں کو اس لیے قائم رکھا جاتا تھا کہ کوئی بچہ بائبل کی تعلیم سے محروم نہ رہ سکے۔ پرائمری سے آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بے حکم اسکول اور اساتذہ میسر تھے۔ اور کالج وغیرہ صرف مراعات یافتہ لوگوں کو ہی میسر تھے۔ خانہ جنگی سے قبل امریکہ کے تمام تعلیمی اداروں کی حیثیت لیے اداروں کی سی تھی جہاں

کو فخر کیا اور ۱۸۶۸ء میں امریکی پہلی ریسرچ یونیورسٹی جانس ہاپکینز (JOHNS HOPKINS) میں قائم ہوئی۔ ان تمام بنیادی تبدیلیوں اور نئے رجحانات کے ساتھ ساتھ ہم اس دور میں ایسے نظریات بھی ابھرتے دیکھتے ہیں جو عوام الناس کی فلاح و بہبود کے بجائے ایک مخصوص طبقے کے مفادات کے حق میں استعمال ہونے لگتے ہیں۔ سٹیوٹ کارکی نے ابتداء میں عورتوں کے حقوق تعلیم عامہ کی سہولتوں کی ذمہ داری طریقہ تعلیم میں بنیادی تبدیلی، لوگوں کو انتخابات میں حصہ لینے کا حق اور غلاموں کو آزادی اور انتخابات میں شرکت کے لیے جدوجہد کی خانہ جنگی میں فتحیابی کے بعد سرمایہ دار طبقہ اپنی سماج کی سیاسی و معاشی باگ ڈور کو کھینچنے کے لیے اپنے کے لیے میدان عمل میں آگیا اور اس محاذ پر کامیابی کے لیے اسے جس ہتھیار کی ضرورت تھی وہ تھا نظریاتی ہتھیار تاکہ لوگوں کو اپنے اقتدار کے حق میں ذہنی طور پر تیار کیا جاسکے۔ اور مزید حقوق و مراعات کو نہ صرف طاقت کے ذریعے بلکہ نظریاتی طور پر بھی رد کیا جاسکے۔

چارلس ڈارون کا نظریہ ارتقاء، جس نے قدیم اعلیٰ خانہ بدو حسب و نسب کے محل کو مساوی کیا تھا اور تمام انسانوں کو بلا تفریق ایک صف میں لا کر رکھا تھا سرمایہ داری نے اسے اپنے اقتدار کو صحیح ثابت کرنے کے لیے نہایت مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چارلس ڈارون کے معتد ہربرٹ اسپینسر (HERBERT SPENCER) نے ڈارون کے حیاتی ارتقاء (BIOLOGICAL EVOLUTION) کے نظریے کو سماج اور حیثیت پر لاگو کر دیا اور اس نے ثابت کیا کہ ارتقاء ناگزیر طور پر ایک ایسے سماج کی طرف رہنمائی کرے گا جہاں انسان کو اعلیٰ ترین (PERFECTION) اور ستر میں حاصل ہوں گی اور یہ کو سماج کی جدوجہد (COMPETITIVE STRUGGLE) ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعہ اعلیٰ ترین PERFECTION تک پہنچنا ممکن ہوگا۔ اس جدوجہد میں کمزور کو ایک جانب دھکیل دیا گیا اور طاقتور ترقی کی جانب بڑھتا رہا۔ اس کشمکش کے باعث جو سماجی نابرابری پیدا ہوئی اس نے ایک جانب بے امتیاز دولت سے مالا مال اعلیٰ بھراؤ کو جنم دیا اور کثیر ترین آبادی کو مفلوک اعلیٰ اور ان سرمایہ داروں کا محکوم بنا دیا۔ اور اس صورت حال کو نظریہ ارتقاء کے عین مطابق قرار دیا گیا کہ عورتوں اور خوشامالی کا حقدار اسے سمجھا گیا جو موزوں ترین اور طاقتور ہو۔ مزید یہ کہ ان حالات کو بدلنے کی کسی بھی سرکاری کوشش کو سماجی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور کیا گیا اور اس طرح ڈارون کے نظریے کو ایک ایسے نظریے کے طور پر چسوس کیا جانے لگا جیسے کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہو کہ موزوں ترین اور طاقتور ہی قائم و دائم رہتا ہے۔ (THOSE WHO SURVIVED WERE)

اگر کسی شخص کے لیے ڈبل کوئی کافی نہیں تو وہ زندہ رہنے کا اہل نہیں۔

(THE FITTEST) سماجی اور معاشی حالات ہر اس تصور کے اطلاق کے ذریعے سائنس کو سرمایہ داری کا حامی بنا دیا گیا۔ اسپینسر کا یہ نظریہ ۹۰-۱۸۷۰ء کے دوران امریکہ میں بڑے مقبول ہوا اور درحقیقت اس نظریے نے امریکی سرمایہ داروں کو اپنے اقتدار اور اپنی تمام تر جائز و ناجائز کارنداریوں کے لیے ایک منطقی جواز فراہم کر دیا تھا۔ اس وقت کا مشہور سرمایہ دار اینڈریو کارنگی نے اسپینسر کے نظریات کے بارے

میں لکھنا پڑھا رکھا جاتا تھا۔ سوچو بوجھ اور علم فراہم کرنے کی صلاحیت سے یہ ادارے قطعی محروم تھے۔ انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں تعلیمی نظام اور اداروں میں نئے اثرات اجاگر ہونے لگے۔ ایسے کالج جہاں کبھی چرچ کی اجارہ داری تھی آہستہ آہستہ سیکور طریقہ تعلیم کی طرف راغب ہونے لگے۔ ۱۸۶۹ء میں ہارورڈ یونیورسٹی نے اپنا صدر پادریوں کے بجائے ایک کیمیا دان چارلس ایلیٹ

ان نظریات کی مقبولیت کی وجہ اس وقت کے وہ
معاشی حالات تھے جو سرمایہ داری کو اجارہ دار سرمایہ داری میں
بدل رہے تھے۔ یہ اجارہ دار سرمایہ داری کس نیزی سے تمام
ملکی وسائل اور ذرائع پیداوار پر قابض ہو گئی اس کا اندازہ
اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگلے تیس سالوں کے اندر اندر
(۱۹۰۲ تک) ایک یا دوسرے قسم کے کاروباری اشتراک
(Combinations) امریکہ میں تمام پیداوار کے چالیس فیصد
حق پر قابض ہو گئے تھے۔ ریلوں کے نظام ۹۵ فیصد حصہ
ٹریس مالیاتی اداروں کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔ تقریباً ۱۳۲۰

انہی دنوں برطانوی ماہر معاشیات آدم اسمتھ کی آزاد تجارت کا معاشی نظریہ (LAISSE FAIRE) بھی امریکہ میں بے حد مقبول ہوا لیکن امریکہ میں اس نظریہ کا استعمال یورپ سے خرا مختلف تھا۔ یورپ سرمایہ دار آزاد تجارت اور آزاد کاروبار کے نظریے کو عالمی منڈی میں اپنا مال بیچنے اور وہاں سے خام مال آزادانہ طور پر حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے جبکہ امریکہ میں اس کا استعمال اندرون ملک آزاد کاروبار کا مقابلہ اور کاروباری معاملات میں سرکاری عدم مداخلت کے لیے کیا جاتا تھا۔ لیکن بیرونی ممالک سے کاروبار کے سلسلے میں وہ اس نظریے کو قطعی استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ۔

TARIFF ACT کے قانون کے تحت وہ غیر ملکی مصنوعات کی امریکہ میں فروخت پر پابندی عائد کرتے تھے یہاں یہ بات بھی سے خالی نہ ہوگی کہ جب ضروروں نے اسی قانون کو مثال بنائے ہوئے یہ مطالبات کیے کہ غیر ملکی مصنوعات کی طرح غیر ملکی آزادی قوت کی بھی ملک میں درآمد بند کی جائے تو اس پر بھی بھی عمل درآمد نہیں کیا گیا۔

سرمایہ داری کے ارتقاء نے جہاں اپنے کثیر حامیوں کو جنم دیا تھا وہیں اپنے کچھ مخالفین بھی پیدا کیے تھے۔ ان میں سیاستدان، ادیب، معلم اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ ایک

اسی طرح ۱۸۷۷ء میں ایک اور مقدمہ (Munn v. Illinois) میں عدلیہ نے (ILLINOIS) کے اس قانون کو منظور کیا جس نے Grain Elevators کے لیے گودام کی

یہ بے رحم سپاہ داران لوٹ کھسوٹ آہستہ آہستہ ایک ایسی تلخ حقیقت بن چکی کہ اس سے نجات کی کوئی راہ باقی نہ بچی تھی۔ اس کی مثال میساچیوسٹ (Massachusetts) ریاست کے اس واقعے سے دی جاسکتی ہے۔ اس ریاست لاپرواہی ٹیکسٹائل صنعت سے صرف اس لیے ہاتھ دھونے پڑے کہ وہاں بچوں کی مزدوری کے خلاف نہایت سخت قوانین تھے نتیجتاً وہ علاقے جہاں ایسی پابندی نہ تھی اس صنعت میں ان سے بازی لے گئے۔ یہ وہ حالات تھے جو شروع میں ایسے

مشہور باغی معلم تھورسٹن ویسٹلم (Thorstein Veblen) تھا جو شکاگو میں اسٹین فورڈ (Stanford) اور مسوری (Missouri) میں پڑھایا کرتا تھا سرمایہ دار طبقے کو "کھیل طبقہ" (Rept Class) کے نام سے یاد کرتا تھا اور ان کے زبردست معاشرے Pecuniary Association پر سخت تنقید کرتا تھا۔ اس نے اس موضوع پر سخت بحث کی کہ صنعتی ترقی میکینک کو جنم دیتے ہیں سرمایہ داروں کا کوئی ہاتھ نہیں بلکہ انہوں نے اس دولت پر قبضہ کر لیا ہے جو دوسرے لوگوں کی محنت اور صلاحیتوں نے جنم دی ہے۔ لیکن دوسری جانب وہ سرمایہ دار طبقہ کو حیانتانی (Bio Logically) طور پر سب سے زیادہ موزوں (Fit) سمجھتا تھا اور انہیں سماج کا ایک ایسا عنصر سمجھتا تھا جسے فطرت نے خود چنا ہو۔ اس کے علاوہ ایسے Reformist بھی منظر عام پر آئے جو

وسائل سے مالا مال ملک میں عوام کی بھاری اکثریت کے پاس سطحی ضروریات کے علاوہ کچھ بھی میسر نہیں وہ فلسفی اور خانہ بدوشوں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ۱۸۷۷ء میں بھی ایک سوشلسٹ پارٹی وجود میں آئی تھی جس کا پروگرام مارکس نقطہ نظر سے متاثر تھا لیکن یہ سیاست سے دور رہی اور KOL اور AFL میں اپنے لیے جگہ بنانے اور اسے اپنے زیر اثر لانے کی کوشش کرتی رہی لیکن انہیں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

آرٹ اور لٹریچر میں بھی خانہ جنگی کے بعد ایک نئی حقیقت پسندی کا رجحان چھپنے لگا۔ اس دور کا بے حد مشہور ادیب مارک ٹوائین (Mark Twain) تھا جس نے طنز و مزاح اور اخلاقیات کے میدان میں اپنے دور کے حقائق پر گہری نظر ڈالی۔ اسی نے اس دور کو Gilded Age کا مخصوص نام دیا اور

۱۸۷۸ء میں ورکنگ مینز پارٹی بنی جو دنیا میں مزدوروں کی پہلی سیاسی تنظیم تھی

سرمایہ داری کے گھناؤ نے نظام کو سخت تنقیدی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک ایسا ہی مصلح Reformist جس نے سرمایہ داری پر کڑی تنقید کی اور ایک یوٹوپیائی حل پیش کیا وہ ایڈورڈ بیلامی (Edward Bellamy) تھا۔ اس نے اپنی کتاب Looking Backward (1888) میں ایک ایسی کمیونٹی کا ذکر کیا جو بیسویں صدی میں موجود ہوگی اور اپنی خوبصورتی اور امن و امان میں انیسویں صدی سے بے حد مختلف دکھائی دے گی۔ اس سماج میں تمام ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت رکھائے گئے اور تمام مادی فائزے سب میں برابر تقسیم کیے جائیں گے۔ Bellamy نے اپنے اس نظام کو Nationalism کا نیشنلزم کا نام دیا تھا۔ جس کے نام پر کئی ایک نیشنلسٹ کلب (Nationalist Club) ملک بھر میں قائم ہو گئے تھے جو اس نئے فقیر کے کا پرچار کرتے تھے۔ سب دلچسپ بات یہ ہے کہ بیلامی (Bellamy) مارکس سوشلزم کو سختی سے رد کرتا تھا اور وہ امریکی مارکسٹوں کو حکومت کا زبردست ہتھیار لفظ "سوشلسٹ" کے بارے میں وہ کہتا کہ اول تو یہ ایک غیر ملکی لفظ ہے اور تمام تر ترغیبات میں بھی غیر ملکی ہے۔ عام امریکی کو اس میں سے پرواہ کی بڑی ہے، اس طرح جھنڈا تمام تر جنسی جدت کی ترغیب کرتا ہے اور اس فدا کے بارے میں نازیبا زبان استعمال کرتا ہے جسے اس ملک میں ہم کم از کم اعلیٰ ترین تنظیم کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

جلد از جلد امیر بننے کی تلگ دو کو حد تک تنقید بنایا۔ مارک ٹوائین کے علاوہ کچھ اور ادیب بھی تھے جنہوں نے اپنے عہد کی امریکی سماج کی برائیوں اور مسائل کو اپنی تخلیقات کے ذریعے کاخی کی جن میں William Dean Howells اور Stephen Leane اور Hamlin Garland کے نام نمایاں ہیں۔ اگرچہ ان تخلیق کاروں نے معاشرتی برائیوں پر سخت تنقید کی لیکن سرمایہ داروں کے بارے میں ان کی رائے اکثر معذرت خواہوں کی سی تھی Howells کے ناول (1889) The Rise of Sincler Lopham میں اس نے لکھا کہ امریکی سرمایہ داروں کی اکثریت اناکاروں پر مشتمل تھی اور لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کا شمار تنقید میں ہوتا ہے۔

محنت کش طبقات کی تنظیم کاری اور جدوجہد کا آغاز

امریکے میں محنت کش طبقے کی بڑھتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف جدوجہد کا آغاز سرمایہ دارانہ نظام کے ابھار کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا لیکن اس کی نوعیت نہایت غیر منظم و غیر واضح اور مخصوص پیشوں اور علاقوں تک محدود تھی۔ محنت کش طبقات جن کی اکثریت آزاد کارگریوں پر مشتمل تھی۔ بڑھتے ہوئے سرمایہ دارانہ تسلط اور اس کی جانب سے تنخواہوں کا کم شرح مقرر کرنے کے خلاف ہوئی تھی۔

ٹرانسپورٹ کے نظام کے بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ ہی استاد کارگریوں کے لیے مختلف ملازمتوں سے کام کے آرڈر بول کرنا اور ان کی تعمیل کرنے کے لیے اپنے ملازم (Manager) کارگریوں سے کام کروانے کی روایت جنم لیتے تھے۔ اس کا وہاں کو جاری رکھنے کے لیے سرمایہ کاروں کا کام کرنے والوں کی بڑی تعداد کی ضرورت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے گئے۔ مائیک کے پیلاؤ کے ساتھ ہی آزاد ملازم کے مفادات اور تعلقات میں تبدیلی آئے تھی۔ استاد کارگری زیادہ سے زیادہ کام کے عوض کم سے کم اجرت ادا کرنا چاہتے تھے۔ جب کہ ملازمین کارگری کم سے کم کام کے عوض زیادہ سے زیادہ اجرت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بڑھتی ہوئی منڈی نے کئی ایک استاد کارگریوں کو آرڈر وصول کرنے اور سال سیلائی کرنے کے کاروبار میں ملوث کر دیا۔ تاجروں کی تعداد بڑھتے گئی اور مقابلہ بھی۔

سوشلزم کے بارے میں اس قسم کے تصورات کے باوجود امریکہ میں سوشلسٹ پارٹیاں قائم ہوئیں۔ پہلی سوشلسٹ پارٹی نیویارک، فلاڈیلفیا، شکاگو، سینٹ لوئی، مل وائی اور دوسرے بڑے شہروں میں خانہ جنگی کے فوری بعد قائم ہوئی۔ ابتدا میں تمام سوشلسٹ کارل مارکس کے پیروار تھے لیکن بعد ازاں ان میں تبدیلی واقع ہوتی چلی گئی، ان سوشلسٹوں کی اکثریت یورپ سے آنے والے نوآباد کاروں کی تھی جنہوں نے امریکی مزدوروں میں انقلابی روح پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی اور مزدوروں کی ایک سیاسی تنظیم National Labour Party کے نام سے ۱۸۷۸ء میں بنائی تھی اور اپنے مشور میں واضح طور پر لکھا تھا۔

"ہماری حکومت اپنے اصل مقصد سے مکمل طور پر دوگردانی کرنے کی مرتکب ہوئی ہے۔ ہمارے اس واحد

تاجروں نے مقابلہ کی وجہ سے قیمتوں میں کمی سے بچنے کے لیے کارنگوں کی اجرتوں میں کمی کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں کارنگوں نے اپنی اجرت کو مناسب حد پر رکھنے کے لیے یونین بنانا شروع کر دیں۔ پہلی یونین فلاڈیلفیا کے موجدوں کی تھی جو ۱۸۹۲ء میں قائم ہوئی اور سال بھر تک اپنا وجود برقرار رکھی۔ ۱۸۹۳ء میں فلاڈیلفیا کے موجدوں نے ایک مستقل یونین.... فیڈرل یونین آف کوورڈ ویزر کے نام سے قائم کی جس نے کئی نمایاں بھی کیں اور ۱۸۰۰ء تک قائم رہی۔ ۱۸۹۹ء میں دو فزیکل ٹیچر ٹیچر سوسائٹی آف جرسی میں کے نام سے نیویارک میں قائم ہوئی تھی۔ پہلی مرتبہ اجرتوں کا سیکیل بنایا اور ان کو منوانے کے لیے ہتھال بھی کی۔ شروع میں یونینیں غیر منظم ہوا کرتی تھیں لیکن مزدوروں کے اجتماعی عمل کے بڑھانے کے ساتھ ساتھ آج اور کارگریوں کو بھی ہتھال کو خلاف قانون اور تالین سزا قرار دینے لگے۔ ہتھال کرنا سزاؤں سے زیادہ جاتا اور جراتے ماند کے جاتے۔

۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۰ء کے ماسخی حالات نے مزدوریوں کے بڑھنے اور پھلنے چھوٹنے کے مواقع فراہم کیے مچی، بیکری والے، اور اٹارمی بنانے والے، راج مزدوروں نے ۱۸۸۱ء میں نیویارک میں منظم ہوا شروع ہو گئے تھے اور گھر ولس کے مزدوروں کی ایک منظم ہتھال ہوئی تھی۔

مزدوروں کی ایک مرکزی تنظیم کی ایک میٹنگ فلاڈیلفیا میں ۱۸۷۸ء میں ہوئی جس میں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس میٹنگ میں ملاز کار پیٹروں نے کام کے دس گھنٹے منوانے کے لیے ایک ناکام کوشش کی تھی اور ملازم کار پیٹروں کی یونین کے سپرینٹنڈنٹ سیکرٹری نے کہا تھا وہ گھنٹے ہیں کہ ایک منٹ کے آئین کا پابند شخص ایک دن میں دس گھنٹے سے زیادہ ایمان دار طور پر ضروری نہیں کر سکتا اور یہ کہ لوگ جنہیں صبح سویر جگھنے سے محروم ہونے تک کام میں جتا رہنے کی عادت ہو گئی ہو مونا اعضاء میاویوں اور دوسرے مرض کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس مطالبے کے جواب میں مالک کارنگوں نے اپنی میٹنگ بلائی جس میں ان مطالبے کو غیر مناسب قرار دیا اور ملازم کارنگوں کے اس قسم کے اجتماعات اور تنظیموں کو ایک قلیل رجحان سے تعبیر کیا۔

کار پیٹروں کی جانب سے ۱۰ گھنٹے کام کے اوقات کے مطالبے نے کارنگوں کے مزید بڑے حصے کو متحرک کیا کا کیا اور وی میکینک یونین آف ٹریڈ ایسوسی ایشن قائم کی جس کی قیادت جی ایم ایبل میں دولت اور طاقت کی اس نابرابری کو وصف تنقید بنایا گیا جو کارنگوں کو تنہا دیتے تھے۔ جمہوریتیں کہا گیا کہ مزدوری تمام دولت کا اصل ذریعہ ہیں اور یہ کہ مزدور محنت کرتے ہیں یہی انہی کا نظری اور ناقابل انتقال حق بھی ہے کہ وہ اپنی محنت کا پھل بھی کھائیں! اس تنظیم میں حصے مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والی تنظیموں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس تنظیم کے آئین سے تمام سیاسی اقدامات کو خارج کر دیا گیا تھا لیکن مختلف مندوبین اس بات پر متفق تھے کہ وہ اپنے مقاصد سیاست کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے۔

۱۸۲۸ء میں ایک ورکنگ مینز پارٹی..... جو کہ دنیا میں مزدوروں کی پہلی سیاسی تنظیم تھی قائم کی گئی جس میں ۵۵ مزدور تنظیمیں شامل تھیں۔ فلاڈیلفیا میں اگست ۱۸۷۸ء کو ورکنگ مینز کی میٹنگ ہوئی جس میں کہا گیا کہ مزدور اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ایک متحدہ طور پر اپنے مفادات کی حفاظت کا انتظام کریں۔ انہوں نے اسمبلی اور سٹی کائونسل کے لیے انتخابی ٹکٹ بھی منتخب کیے اور قومی انتخابات میں اپنے نمائندے کھڑے کیے جنہوں نے اپنے علاقوں سے بھاری تعداد میں ووٹ ملے لیکن منتخب کوئی نہ ہو سکا۔ خاص کر وہ نمائندے جو صدر ریڈر یوجینس کے ٹکٹ پر کھڑے اور ورکنگ مینز پارٹی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے

ورنگ بینڈ پارٹی مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ اتحاد قائم کرتی رہی تھی اور مختلف رکاوٹوں، نظریاتی اختلافات اور التزامات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو ۱۸۲۱ء کے انتخابات تک برقرار رکھ سکی تھی۔ اس دوران اس نے مختلف نوعیت کے سیاسی اور مطالباتی بھی کیے جس میں تعلیمی نظام اور انفرادی پیمانے پر چلایا جا رہا تھا اور انفرادی مفادات اور Speculation پر قائم تھا صرف تنقید بنایا اور ان حالات پر ٹیکہ بینڈی جو عام لوگوں کو اپنے حقوق کو اس کو مل بھیجے کے بجائے کام پر بھیجنے کے لیے مجبور رہی ہوں نے حق سرکاری اسکولوں کا مطالبہ کیا اور بارہ و در سرمایہ دارانہ اور ملک کے نظام کو حد تک تنقید بنایا۔ ٹیوٹی، مزدوری ملنے سے سروس فرض کی عدم آویسی کی صورت میں تنقید کی سرزخم کرتے اور ۱۸۲۱ء کے انتخابات کا مقابلہ کیا۔ وہاں توں کہ کسانوں نے بھی وورنگ بینڈ پارٹی بنائی تھی کیونکہ وہ بھی خود کو محنت کشوں میں شمار کرتے تھے۔

کسان اور دوسرے محنت کش طبقات بھی شامل تھے اور جو بیچہ رہے تھے کہ جنکس کی کامیابی ان کی اپنا کامیابی ہے اس کی صرف اسنے والاوت ہے ان کی اس خوش فہمی کو تو کرکسکا تھا۔

کچھ ہی عرصے بعد ۱۹۸۶ء کو مخالف دھڑوں میں بٹ گئی جن میں سے ایک سیاست کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتا تھا اور دوسرا زراعی کاموں کو۔ یہ اختلافات بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہ پارٹی اپنے سیاسی نقطہ نظر میں سرمایہ دارانہ طبقہ سیاست پر انحصار کرتی تھی اور جو کئی بھی ان کے نظریات کی حمایت کر دے وہ اسے اپنا نمائندہ اور حامی قرار دیتی تھی۔ ذاتی ملکیت کے بارے میں اس کا تصور سرمایہ دارانہ تصور سے زیادہ مختلف نہ تھا۔

دسمبر ۱۹۸۶ء کی ایک ٹینک میں ایک شیفٹ منسٹ استاد اور ذاتی طور پر پڑھا لکھا دانشور محسن آسنگھ جو معاشرے کی بنیادی طور پر ساز و سازش بنیادیں رکھتا اور سماجی اور ملکیت کی مساویانہ تقسیم کا حامی

مزدوروں کی اپنی صفوں میں شامل کرنے کا اظہار بھی کیا گیا اور پٹرول
کو مزدور مفاد کے خلاف اور سیاس جال بازوں کے ہاتھوں میں
کھلے جانے کا باعث بتایا گیا۔

ٹریڈ یونٹیشن لاز جو غیر ملکی مصنوعات کی امریکی پیش
فروقت پر پابندیوں یا بھاری ڈیوٹی سے متعلق مقالہ جو امریکی
سرمایہ دانوں کو یورپی متفقہ مصنوعات سے مقابلے کے بغیر اپنی
مصنوعات یا آسانی ملی منڈی میں بھیجنے کے مواقع فراہم کرتا تھا
اس پر بھی بڑی تنقید کی گئی اور غیر ممالک سے تعداد و تاحیکن
وطن کو آنے کی اجازت دینے اور اس کے نتیجے میں مقامی اور
تارکین وطن مزدوروں میں مقابلے سے پیدا ہونے والی مقامی مزدوروں
کی بے روزگاری کے خلاف بھی اظہار شیل کیا گیا۔

۱۸۷۰ء کے کنونشن میں ۶۷ مفدو بین نے شرکت کی اور
اس میں ایکسٹراڈ جرفرسٹ انٹرنیشنل کے اصولوں کو تسلیم

لیکن مزدوروں کی ہڑتال کے نتیجے میں واپس آ کر نئے سے بعض
 رہے اور WBA راتوں رات ایک طاقتور تنظیم بن گئی۔ ایک سال
 بعد کان کے مالکان کی جانب سے تنخواہوں میں کمی کی دوبارہ کوشش
 کی گئی جو مالکان اور مزدوروں کے درمیان ایک معاہدے پر اصرار نہ کر
 ہوئی۔ کانوں کے مالکان کی اکثریت ملک کی بڑی بڑی ریلوے لائنوں
 کے مالک سرمایہ داروں میں سے تھی جن میں ایک فریڈریک ویڈر
 تھا جس کی فلاڈیلفیا اور دیگر ریلوے لائنیں تھیں اور کئی ایک کالیں
 بھی اس کی ملکیت تھیں۔ ان کے کانوں کی اس تنظیم WBA
 کو ناکام کرنے کے لیے کوئلہ سے جانے والے مال گاڑیوں کے
 کرائے میں اضافہ کر دیا تاکہ دوسری کانوں کے مالکان اعتراضات
 میں اصرار کے باعث کانوں کے ساتھ اگلے سال تنخواہوں
 میں اضافے پر رضامند نہ ہوجائیں۔
 ۱۱ مارچ ۱۸۶۹ء کو کانوں کی جانب سے ایک کانٹل
 قائم کی گئی جس کا مقصد مقامی کانوں کے مسائل سے نمٹنا تھا
 ۲۹ اپریل کو جنرل کاؤٹل نے کانوں کو ۱۰ اگست ۱۸۶۹ء کو کام
 روکنے کی ہدایت کی جس کا مقصد کوئلے کی سپلائی میں کمی کرنا
 اور تھینکاس کی قیمتوں میں اضافہ کرنا تھا تاکہ کانوں کی تنخواہیں
 بھی بڑھ سکیں۔

۱۸۷۷ء میں تنخواہوں میں دس سوپے کی کے خلاف کانوں کی ہڑتال چھ ماہ تک جاری رہی

اسی دوران کان کے مالکان نے بینکر سائیکلہ ڈیٹن ٹریڈ
 قائم کر لیا اور تنخواہوں میں ایک وٹس کی کاراؤہ ظاہر کیا جسے کان
 نے ٹھکرا دیا اور ہڑتال پر چلے گئے F.B. Governor نے
 اختلافات طے کرنے کے لیے کہا اور ۱۸ جولائی میں کانوں اور
 مالکان میں ایک تحریری معاہدہ طے پایا جس کے مطابق کوئلے کی
 قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کانوں کی تنخواہوں میں ایک
 مناسبت کے ساتھ کمی زیادتی کی جاسکتی تھی۔
 ۱۸۷۳ء کے آخر میں کان کے مالکان کی جانب سے تنخواہوں
 میں ۱۰ روپیہ کمی کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں کان ہڑتال
 پر چلے گئے اور تقریباً ۱۱ ماہ کے طویل عرصے تک یہ ہڑتال برقرار
 رہی جس نے یونین کی کمزوری اور اگلے چار برس تک اس
 علاقے میں کوئی یونین کام کرنے کے قابل نہ ہو سکی۔ اس طویل
 ہڑتال کے دوران اور اس سے پہلے بھی کانوں کے درمیان
 سخت اور تکلیف دہ حالات کے باعث آہستہ آہستہ لیکن
 اشتعالی کاروائی کے رجحانات پروان چڑھتے رہے تھے لیکن
 ۱۸۷۳ء کی طویل ہڑتال کے دوران اور اس کے بعد یہ واقعات
 بہت بڑھ گئے اور اس کے پچھلے کانوں کا ایک خفیہ گروہ
 مولی میگائٹرز کے نام سے سرگرم عمل تھا۔ مولی میگائٹرز اس
 ہڑتال کو قائم رکھنے کے لیے نہایت سخت رویہ اپنا رہا تھا اور
 کان کے مالکان سے کم تنخواہوں پر معاہدہ کرنے سے کانوں
 کو بعض رکھنے کے لیے حالات کی خرابی کے باوجود ہر پور کوشش
 کی تھی۔ انہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے قتل و قمار
 گری کے اقدامات کو بھی استعمال کیا تھا مولی میگائٹرز کے ہاتھ
 ہوئے دہشت پسندانہ اقدامات سے منبٹھ کیے ایف بی ڈیون
 چیپمین ان میں آ کر آیا اور حالات کو اپنے طبقے کے مفاد میں طے کرنے
 کی کھائی۔ اس سلسلے میں اس نے پکڑ ڈن ٹیڈیکٹر وایجسٹی
 سے رابطہ قائم کیا جو سرخ رسانی کی یونین تھی اور پچھلے پچھلے سے
 صنعتی اداروں میں سرمایہ داروں کے مفادات کے خلاف کی تلوار یعنی
 خدلت فراہم کر رہی تھی۔ سرزماسا ایجنسی نے اپنا ایک ایجنٹ کان
 کنوں کے بھیجے میں کانوں میں شامل کروا دیا اور ۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۶ء
 کے درمیان مولی میگائٹرز کا گروہ کتنا کر لیا گیا جن میں سے ۱۰۰ آدمیوں

کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔
 ۱۸۷۷ء کی ریلوے ملازمین کی ملک گیر ہڑتالیں۔
 مولی میگائٹرز۔ پینسلوانیا کے چھوٹے سے علاقے میں ٹرک
 تھے لیکن ۱۸۷۷ء کا اجمار ایک نہایت ہی خطرناک مشکل تھا جو امریکی
 صنعت کے دوسرے شعبوں تک پھیل گیا۔ اس کی وجہ اس کا جو لائی
 ۱۸۷۷ء میں بائیں اور اوپر بائیں ریلوے کے فائر مین اور بریک مینوں
 کی جانب سے تنخواہوں میں کمی کی کوشش کرنے سے انکار پر ہوئی
 اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں پھیل گئی۔
 اگرچہ ۱۸۷۶ء میں یونین اور ریلوے کی تنخواہوں
 میں کمی کی کوشش تھی۔ برادر ہڈ آف لوکوموٹو انجینرز Brotherhood
 of Locomotive Engineers جو کہ ریلوے مزدوروں
 کی ایک یونین تھی اس نے مزدوروں کے اس نقصان کو پورا کرنے
 کے لیے ۱۸۷۷ء میں ۱۰ فیصد تنخواہوں میں اضافے کے لیے کہا
 جسے انکار کیا۔ اسے اسے انکار کر دیا۔ مارچ ۱۸۷۷ء کو برادر ہڈ
 نے فلاڈیلفیا اور دیگر ریلوے کے ۲۰ فیصد تنخواہوں میں اضافہ
 کے لیے کہا لیکن مطالبات کی نامنظوری کی صورت میں ہڑتال کی گئی
 تھیں۔ دسی۔ انڈیانا نے متعلقہ انجینروں کو اپنی یونین سے استعفی

ہوئے یا ملازمت چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ یونین کے ان حالات
 کے پیش نظر اپریل ۱۸۷۷ء میں ہڑتال کا اعلان کر دیا لیکن
 ایڈیٹور جو کہ پہلے WBA اور مولی میگائٹرز کو ٹھکانے لگا چکا تھا اس
 نئی دہلی کو باآسانی قبول کرنے کو تیار نہ تھا اور وہ باآسانی اس
 مقابلے کو بھی جیت گیا۔ ریلوے مالکان کی اس فتح نے دوسرے
 ریلوے مالکان کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کے لیے اکسا دیا
 دوسرے ریلوے ملازمین کی تنخواہوں میں کمی کوئی کیجائے تھی۔
 بائیں اور اوپر بائیں ریلوے مزدوروں نے ہر حال
 تنخواہوں میں اس کمی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ فائر مین اور
 بریک مینوں نے گاڑیاں چلانے سے انکار کر دیا کوئی نہ
 متبادل ملازمین کو بھی نہ لیا لیکن ہڑتالی مزدوروں نے
 پھرتی کے جانے والے مزدوروں کو گاڑی چلانے سے بعض رکھے
 کی کوشش کرتے رہے۔ پولیس نے حالات کی کشیدگی کے
 باعث گرفتاریاں شروع کر دیں۔ یونین نے تنخواہوں میں کمی کا
 دوبارہ اعادہ کرتے ہوئے میری لینڈ کے گورنر کو یونین دلا یا کونج
 کو بلائے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور تمام حالات بخیر و خوشی طے
 پا جائیں گے۔ گاڑیاں مول کے مطابق شہر سے مل چکی ہیں لیکن
 مارنبرگ میں انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ ناشر مین
 اپنے انجمن کو چھوڑ کر چلے گئے اور کچنی کے وائس پریزیڈنٹ
 نے گورنر کو فوج بھیجنے کے لیے رابطہ قائم کیا اگرچہ ریلوے کی
 ملکیت کو اس تک کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ جنرل فاکنسر
 موقع پر پہنچا اور مال گاڑی کو چلانے کی کوشش کرنے لگا جس
 کے نتیجے میں ایک ہڑتالی مزدور جو گاڑی روکنے کی کوشش
 کر رہا تھا مارا گیا اور ایک فوجی علیشا بھی زخمی ہو گیا۔ جنرل فاکنسر
 ان حالات کے پیش نظر فوج کو دایسی کا حکم دے چکے ہوئے
 دیا کہ اس نے وہ اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔ گورنر نے سمجھوتے
 نتیجے میں وفاق سیکریٹری وفاق سے رابطہ قائم کیا اور وفاق فوج
 کی مدد مانگی کیونکہ اس کی نظریں ریاستی فوج ہڑتالیوں کی
 طرف دار تھی۔ وفاق فوج کے کمانڈر کا رویہ بھی ریلوے مالکان
 کو زیادہ مناسب نہ لگا اور جنرل فریڈریک ہڈا ہڈاں سے
 وائس آفیسر ایک ایک تک میں نے اپنی فوجی ذمہ داریاں مزدوروں

کا خون چھٹے بغیر محسوس تو ہی ادا کی ہیں لیکن یہ بہتر ہو گا کہ
 کوئی اور اس فوجی ریلوے کارپوریشنوں کے لیے غیر متنازع ہو
 بھیجایا جائے گا۔ اگرچہ ریلوے انتظامیہ اور سرمایہ دار طبقہ
 مزدوروں کے ساتھ اس مقابلے میں کسی رد و رعایت اور سمجھوتہ
 کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اگرچہ کہ مزدوروں کی جانب سے
 ان کی ملکیت کو نقصان پہنچانے یا کسی اور انتہا پسند اقدامات
 کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا لیکن سب سے بڑا خوف جو سرمایہ دار
 طبقے کو پریشان اور بے رحمت کاروائی کرنے پر اکسار رہا تھا
 وہ تھا مزدوروں کا بڑھاپا اور اتحاد اور اس کے نتیجے میں پیدا ہوا
 نیا شعور۔ جمہوریت کے یہ بھیکار ملک میں چند سرمایہ دار کش
 تعداد مزدوروں سے کہیں زیادہ اہم اور قابل تنظیم تھے خواہ ان کے
 اقدامات کتنے ہی غیر منصفانہ اور غیر انسانی کیوں نہ ہوں
 جنرل کیجی نے ان تمام فوجی افسروں کو وہاں سے ہٹا دیا جو
 ہڑتالی مزدوروں کے خلاف سخت اقدامات کے خلاف تھے
 اور جولائی کے آخر تک ٹرینوں کی آمد و رفت پوری طرح بحال
 کر دی گئی۔ اسی دوران ٹمبرگ میں بھی ریلوے ملازمین نے ہڑتال
 کر دی جو گاڑیوں کی لیا گیاں چھڑاتے اور گاڑیاں چلانے کے قابل
 کو ۸ میل سے بڑھا کر ۱۱ میل کرنے کے خلاف تھے۔ ہڑتالی مزدوروں
 کی جگہ دوسرے مزدوروں کو لایا گیا لیکن انہوں نے بھی اس حکم کو
 ماننے سے انکار کر دیا۔ جب نئے مزدوروں کی بھرتی کی گئی تو یہ
 نے ان پر ہڈ بول دیا ہے۔ نتیجتاً ۱۹ جولائی کی رات کے علاقے میں
 کوئی ٹرین بھرت نہ کر سکی۔ بینٹن گاڑی، گورنر کی ہدایت پر
 جائے وقوع پر پہنچ گئے اور ہڑتالی مزدوروں کے ہڈوں کو گورنر
 کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کوئی نہ جھگڑے تک پہنچ گیا لیکن
 ہڑتالی مزدور زخمی ہو گیا اور انہوں نے سپاہیوں پر پتھر اور شروع
 کر دیا۔ پولیس کو گولیاں چلانے کا حکم دے دیا گیا لیکن پولیس
 ہڑتالی مزدوروں کے ساتھ ہو گئی۔ اسی قسم کے مزید ہڑتالیں ملک
 کے دوسرے حصوں تک بھی پھیل گئیں جن میں ریاستی اور وفاقی
 فوج کی بھاری تعداد اور غلامانہ طریقوں سے ہی ختم کیا جاسکا۔
 ان ہڑتالوں کا اثر متعلقہ مزدوروں کے علاوہ دوسرے مزدوروں
 اور دوسرے طبقات پر بھی ہوا۔ مختلف مزدور تنظیموں نے نیویارک
 میں ٹامپسن اسکاٹ میں میٹنگ کی اور ریلوے ہڑتالیوں سے
 اپنی ہمدردی اور یکجہتی کا اظہار کیا۔ نیویارک سن، "کے ایڈیٹر
 جان سوٹن نے مزدوروں کی تنخواہوں میں کمی اور ان کی ہڑتالوں
 کو غلامانہ طریقے سے چلنے پر کڑی تنقید کی۔ اسی قراردادوں منظور
 کی گئیں جس میں مزدور طبقے کو متحد ہونے اور اپنی ایک ایسی یونین
 پارٹی بنانے کی نصیحتیں کی گئیں جو ایک ایسا انقلاب برپا کر سکے
 جو کارپوریشن کے چور طریقوں کی بجائے انسانی سے حاصل کردہ
 کو چھین لے۔

امریکہ کی تاریخ میں ان ہڑتالوں کے دوران پہلی مرتبہ
 وفاق فوج کو مزدوروں کے تنازعات کے خلاف استعمال کیا گیا تھا
 اس سے پہلے صرف خاندانی کے دوران وفاق فوج کو ریاستوں
 کے معاملات میں کاروائی کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔
 ان واقعات نے امریکہ کے اس عقیدے کو ختم نہیں کر دیا کہ
 مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان کشیدگی اور اختلافات
 جو کہ یورپی ملکوں کو تک کرتے رہے تھے امریکہ کی سرزمین پر
 جنم نہیں لے سکتے۔

باقی آئندہ



شریف آدمی

فرماندہ

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں،

حسینؑ جب دشتِ کربلا میں

نیریز سے پہنچے آنے لگے

علیؑ کا بیٹا، خدا کے محبوب کا نواسا

خلیفہ وقت کے مقابل

چٹان بن کر ڈٹا ہوا تھا

تو میں کہہ رہا تھا؟

اگر میں سبطِ نبیؐ کے مظلوم جاں نثاروں کی صف میں ہوتا
شہید ہوتا۔

نیریز کی فوج میں جو ہوتا

تو حق کی آواز کو دہانے پہ خلعتِ فاخرہ ہی پاتا،

مگر شہادتِ مرا مقدر نہیں بنی تھی

نہ مجھ کو خلعت ہی مل سکی تھی

تو میں کہہ رہا تھا؟

جو میں نے سوچا تو میں نے جانا

نہ میں ادھر تھا نہ میں ادھر تھا!

مجھے حسینؑ اور ان کے سارے اصول، سب ہی عزیز تھے پر

مرے مفادات مجھ کو ان سے عزیز تر تھے،

مرے مفادات جو عبادت تھے مری ذات و میرے بچوں کی عافیت

وہ حاکم وقت کی نگاہِ کرم کے محتاج و منتظر تھے،

یہی سبب ہے کہ حق و باطل کے معرکے میں

صحیح غلط کی تمیز کے باوجود خاموش ہی رہا میں،

مگر جب اک بار کر بلا اور نیریز سب ہی گزر گئے تو

حسینؑ پیارے ہی مر گئے تو

مری حیثیت نے جوش مارا

نیریز کو میں نے ظلم اور جبر کی علامت بنا کے چھوڑا

حسینؑ کو میں ہزار برسوں سے رو رہا ہوں۔!

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں

مرے ائمہ کہ جن کے علم و عمل کی خوشبو

مشامِ جان میں بسی ہوئی ہے

مرے ائمہ کہ آج بھی جن کے پاک قدموں کی پاک مٹی
کر وڑوں آنکھوں کی روشنی ہے،

انہی ائمہ کی پشت جب ظالموں کے ہاتھوں سے خونِ کھال تھی

خلیفہ وقت کے عقوبتِ کدوں میں ان کی تمام ہستی لہو لہاں تھی،

تو میں کہہ رہا تھا؟

وہ حق پہ ہیں میں یہ جانتا تھا

امام بھی ان کو مانتا تھا

مگر جب ان پر عتاب آیا

تو میں نے حاکم کا ہاتھ روکا

نہ میں نے جلاد ہی کو ٹوکا

کہ مجھ کو اپنی اور اپنے بچوں کی عافیت ہی عزیز تر تھی،

مگر یہ سیلاب ٹل گیا تو

زمانہ کروٹ بدل گیا تو

مری عقیدت بھی لوٹ آئی

میں ان ائمہ کی ذات کو روشنی کا مینار کہہ رہا ہوں

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں!

کہ جب وہ منصور کو سر دار لا رہے تھے

جب اس کے جرمِ خود آگہی پر وہ اپنے فتوے سنارہے تھے

جب اس کو زندہ جلارہے تھے

تو میں کہہ رہا تھا؟

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے

کہ جس خلیفہ نے اس کے فرمانِ قتل پر دستخط کیے تھے

وہ میں نہیں تھا۔

وہ ہاتھ جس نے عظیم انسان کی زندگی کا دیا بھجایا

مرا نہیں تھا

مگر یہ سچ ہے

کہ یہ تماشا بھی میں نے دیکھا

مجھے یہ اچھا نہیں لگا تھا

مگر یہ سچ ہے،

کہ چپ رہا میں

کہ ہر شریف آدمی کی مانند

مجھے بھی اپنی اور اپنے بچوں کی عافیت ہی عزیز تر تھی،

مگر وہ طوفان گذر گیا تو

خلیفہ وقت مر گیا تو

ضمیر میرا بھی جاگ اٹھا

میں ساری دنیا میں اب یہ اعلان کر رہا ہوں

حسینؑ منصور میری نظروں میں ذی حشم ہے

کہ ہر وہ حق ہیں

جو مہندہ دار تک پہنچ جائے محترم ہے!

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں

کہ سارے نمرود، سارے خدّاد

سارے فرعون۔ ان کی اولاد

سب صحیح تھے،

وہ سب صحیح تھے کہ اپنے اپنے مشن کی تکمیل کر رہے تھے

وہ سب صحیح ہیں کہ اپنے اپنے مشن کی تکمیل کر رہے ہیں،

غلط تو میں تھا

غلط تو میں ہوں

کہ ہر زمانے سے اجنبی سا گذر گیا میں

نہ ٹھیک سے جی رکھا کبھی میں نہ ٹھیک سے رکھا کبھی میں،

غلط تو میں تھا

کہ میری تقویم روزِ شب میں

کبھی کسی فیصلے کی کوئی گھڑی نہیں تھی،

مرے قبیلے کے واسطے تو

کوئی قیامت بڑی نہیں تھی،

کہیں کوئی گر بلا بسا ہوا،

کسی عقوبت کدے میں زنداں کے کوئی سوچ ہی سمجھ رہا ہوا

فرارِ دار و رسن سے کوئی صدائے حق ہی لگا رہا ہوا،

تو ہر شریف آدمی کی مانند

میں اپنے حق آگہی کے باوصف سوچتا ہوں

نہ میں ادھر ہوں، نہ میں ادھر ہوں !!!